بالقاہرۃ فی ثلاث واربعین (وثمانمائۃ) فاخذ منہ مجالس من البخاری وتناولہ منہ الضوء اللامع جلد ۱۰ ص ۱۴۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود گاوان ہمارے شیخ کے درس صحیح بخاری میں شریک ہوا، بخاری شمس خفی کی وطنی نسبت نہین ہے، بلکہ اس سے مراد صحیح بخاری ہے،

صد پارۂ دل، از جناب خواجہ دل محمد صاحب ایم اے سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور،

مصنف کہنہ مشق شاعر ہین صد پارۂ دل اُن کی رباعیون کا مجموعہ ہے، جو موضوع کے اعتبار سے پانچ حصون مین تقسیم ہے، میخانہ عرفان، طلسم شہود، اسرار و حقائق، اعمال و اخلاق، نیرنگ جذبات، ان تمام موضوعون پر حکیمانہ رباعیان ہین، اور پورا مجموعہ خیالات کی گہرائی وپختگی زبان وبیان کی صحت وصفائی اور دوسرے محاسن شاعری کے اعتبار سے مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

حیات جاودان، از سیدہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت تحریر نہین، پتہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

اس دور کے شعرا مین جناب شفیق جونپوری کا کلام جدید وقدیم رنگ کی آمیزش کا نہایت دلکش نمونہ ہے اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ نکی لطافت وپاکیزگی، زبان کی صحت وصفائی، اصول فن کی پابندی مشق ومہارت کی پختگی ہر لحاظ سے نئے دور کے شعرا مین امتیازی حیثیت رکھتا ہے، مصنفہ نے اس کتابچہ مین ان کے مختصر حالات اور کلام کی مختلف اصناف پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور انکے نمونے دیئے ہین،

"م"

جلد ۶۳ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

دار المصنفین نے جو مذہبی، علمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں ان سے اصحاب علم پوری طرح واقف ہیں، اس نے اسلامیات کی ہر شاخ اور اردو زبان و ادب پر محققانہ لٹریچر اور معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا، غیر مذہبی خالص علمی خدمات سے بھی اس کا دامن خالی نہیں ہے، اس کے کاموں کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے علمی اداروں اور وہاں کے علماء و محققین تک نے کی، اسکی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے، اور اس نے اپنی تصانیف سے ملک میں سنجیدہ تالیف و تصنیف اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک معیار قائم اور اس کا مذاق پیدا کر دیا،

اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ اس کی مطبوعات ہیں، ان کی مانگ زیادہ تر پنجاب اور دلی میں تھی، اس لیے ہندوستان کی تقسیم اور پنجاب اور دلی کی تباہی کا اسکی تجارت پر بڑا اثر پڑا، گو اس کی کتابوں کی مقبولیت اور طلب اب بھی قائم ہے لیکن جب تک دونوں ملکوں کے درمیان رسل و رسائل کی دشواریاں دور نہ ہو جائیں، اس وقت تک انکی پوری تکمیل نہیں ہو سکتی، بعض علم دوست ریاستوں سے جو امداد ملتی ہے وہ موجودہ ریاستی انقلاب میں نہیں کہا جا سکتا کب تک قائم رہ سکے گی، کاغذ کا قحط، دوسرے سامان طباعت و اشاعت کی گرانی اور ملک کے عام اقتصادی حالات کی ناسازگاری اس پر مستزاد ہے، ان حالات میں دار المصنفین کا کاروبار چلانا مشکل ہو رہا ہے،

دوسری طرف ہندوستان کے انقلاب اور اس کے اثرات و نتائج نے دار المصنفین کے کاموں کو اور زیادہ ضروری بنا دیا ہے، اور اس پر نئی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں، لاہور جو اردو کا بڑا مرکز تھا ہندوستان سے نکل گیا، ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ختم ہو گئی، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کا اردو کا شعبہ توڑ دیا گیا، مکتبہ جامعہ دلی کے ہنگامہ میں تباہ ہو گیا، حیدر آباد کے اردو زبان اور اسلامیات کے ادارے چند دنوں کے مہمان ہیں، ایسی حالت میں جو ادارے باقی رہ گئے ہیں انہی پر آیندہ اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کا مدار رہ گیا ہے، اور ان کو بہر حال قائم رکھنا ہے، اس لیے دار المصنفین انشاء اللہ اپنا کام پورے استقلال سے جاری رکھے گا بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اس میں اور زیادہ وسعت دے گا،

ابھی اس کے بہت سے پرانے کاموں سیرۃ النبی، سلسلۂ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کی تکمیل باقی ہے، اور نئے حالات نے بعض نئے کام پیدا کر دیے ہیں، ضرورت ہے کہ اب ہندی میں بھی اسلامیات پر لٹریچر پیش کیا جائے، اور مسلمانوں کو اندرونی اور بیرونی غیر اسلامی اثرات اور تحریکوں سے بچانے کیلیے مضامین اور کتابیں لکھی جائیں، یہ دونوں کام دار المصنفین کے پیش نظر ہیں، لیکن ان سب کا دار و مدار سرمایہ پر ہے، دار المصنفین تو انشاء اللہ اپنا کام کرتا رہے گا، لیکن دوسروں کے بھی کچھ فرائض ہیں،

دار المصنفین جب سے قائم ہوا ہے، الحمد للہ آج تک اس نے کبھی عام چندہ کی درخواست نہیں کی، اور اب بھی وہ اس وضعداری پر قائم ہے، ایک مرتبہ اس کو مالی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی، تو اس کو بیس روپے سالانہ ممبری کی شکل میں قبول کیا تھا، اور اس کے معاوضہ میں رسالہ معارف اور اپنی سالانہ مطبوعات معاونین کی خدمت میں پیش کی تھیں، دار المصنفین کے بعض ہوا خواہوں کی رائے ہے کہ اس طریقہ کو پھر جاری کیا جائے، اور چونکہ بعض قدر دان بلا معاوضہ مدد کرنا چاہتے ہیں اس لیے

ممبری کی فیس بہ ترتیب تیس اور پچاس روپے سالانہ کر دی جائے، دونون قسم کے ممبرون کی خدمت مین ممبری کی مدت تک رسالہ معارف اور سالانہ مطبوعات پیش کی جائینگی، یا اس قیمت کی پرانی مطبوعات جن کو وہ پسند کرینگے دیجائینگی، یہ ضروری نہین ہے کہ ممبری مستقل اور دائمی ہو بلکہ ایک دو سال کے لیے بھی ہو سکتی ہے،

اگر تیس روپے سالانہ کے پانچ ہزار ممبر بھی ہو جائین تو دار المصنفین کی موجودہ مشکلات بھی دور ہو جائینگی، اور پرانے کامون کی تکمیل اور نئے کامون کے شروع کرنے مین بھی مدد ملے گی، دار المصنفین کے قدر دانون کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ تعداد آسانی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے، ہم کو یقین ہے کہ دار المصنفین کے ہمدرد و ہوا خواہ اپنے اپنے حلقۂ اثر مین ممبر سازی کی پوری کوشش فرمائینگے، اور مطلوبہ تعداد بہت جلد پوری ہو جائے گی، یہ اردو زبان کے حامیون اور اسلامی کلچر کے محافظون کا بھی امتحان ہے کہ ان سے انکی محبت کا دعویٰ محض زبانی ہے یا اس کے لیے وہ عملاً بھی کچھ کرنا چاہتے ہین،

ادھر مہینہ ڈیڑھ مہینے سے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مزاج ناساز تھا، اب الحمد للہ رو باصلاح ہے، ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ ممدوح کی صحت و عافیت کے لیے دعا فرماتے رہین، کہ دار المصنفین کی زندگی اور اس کا وقار اسی ذات گرامی سے وابستہ ہے، گذشتہ مہینہ کے آخر مین بزرگ محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی عرصہ کے بعد دار المصنفین تشریف لائے تھے، اور رفقا کے کامون کو ملاحظہ اور علمی مشورون سے مستفید فرمایا،

مقالات

ہندوستان کے کتب خانے

(۳)

از
جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

سلاطین فاروقیہ کا کتب خانہ

سلطان فیروز شاہ تغلق کے آخری عہد مین بڑے بڑے صوبون پر جن لوگون کو ناظم بنایا گیا تھا، وہ اس کی وفات کے بعد خود مختار ہو گئے، ان ہی مین سے ملک راجہ بھی تھا، جس نے اپنا نسب حضرت فاروق اعظمؓ سے ملایا تھا، اسی لیے اس سلطنت کا نام فاروقی ہے،

سلطنت فاروقی ساتوین صدی کے آخر سے شروع ہوئی، اور ۱۰۰۸ھ مین اکبر اعظم کے ہاتھون اس کا خاتمہ ہوا، یہ خاندان بھی علماء، فضلاء، شعراء اور صوفیون کا قدردان تھا، اس کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ خواجہ مرزا علی اسفرائنی نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، خود فرشتہ نے جب وہ ۱۰۱۳ھ مین برہان پور گیا ہے، اس کتب خانہ کی سیر کی، اس مین اس کو ایک کتاب ایسی ملی جس مین شاہان فاروقی کے سنین جلوس و وفات تحریر تھے، جس سے فرشتہ نے اپنی کتاب مین نقل کیا ہے۔[1]

---

[1] فرشتہ ص ۲۷۷، نولکشور ج ۲

برطانوی عجائب خانہ مین ایلیٹ صاحب کے کاغذات کے ساتھ ملک الشعراء فیضی کا
ایک رقعہ بنام راجہ علی خان فاروقی والی خاندیس محفوظ ہے، اس رقعہ مین اس نے والی خاندیس
سے استدعا کی ہے کہ تغلق نامہ کا جو نسخہ اس کے پاس ہے اس کے اول اور آخر کے چند اوراق
ضائع ہوگئے ہین، اس لیے وہ اپنے نسخہ سے ان کو نقل کرا کے بھیجدے، اسکے الفاظ یہ ہین:

"از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسۂ امیر خسرو ہست، چند ورق از اول وچندے
از آخر رفتہ، التفات فرمودہ دو جز از اول وہمین قدر از آخر بہ یکے از خدمت گاران
امر فرمایند کہ بہ خطے مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند"[1]

اس تحریر سے یہ تو معلوم نہین ہوتا کہ والی خاندیس کے پاس کوئی بڑا کتب خانہ تھا، لیکن
اشارۃً اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ والی خاندیس کو علمی اور ادبی ذوق ضرور تھا، اس لیے وہ
اپنے مذاق کی منتخب پسندیدہ کتابون کا مجموعہ اپنے پاس رکھتا تھا،

شاہان اودھ کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے کمزور ہو جانے پر بارھوین صدی ہجری کے وسط مین
برہان الملک سعادت علی خان کو اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا، کچھ دنون کے بعد اس نے خود مختار
ہو کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی، اس کی آٹھ پشتون نے ۱۸۵۶ء تک اودھ کے پایۂ تخت
لکھنؤ مین حکومت کی۔

دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ کا شباب تھا، نواب آصف الدولہ کی بدولت اہل علم و
صاحب کمال لکھنؤ مین جمع اور مختلف علوم وفنون کے لیے مدرسے قائم ہوگئے، ان کے ساتھ
ساتھ کتب خانے بھی قائم ہوئے ہون گے، چنانچہ لکھنؤ مین متعدد مشہور کتب خانے تھے، ان مین
شاہی کتب خانہ کا حال ایک انگریز اسپرنگر نے جو ۱۸۴۸ء مین لکھنؤ آیا تھا، لکھا ہے۔

---

[1] معارف نمبر ۵ جلد ۲۶ ص ۳۴۷

شاہی کتب خانہ قدیم دولت خانہ مین تھا، یہ دولت خانہ رومی دروازہ کے پاس لوہے
کے پل کے پیچھے گومتی کے نزدیک تھا، افسوس ہے کہ اس دولت خانہ کا اب کوئی نام ونشان
بھی نہین رہا، غالباً وکٹوریہ پارک اور لوہے کے پل کے درمیان کسی جگہ رہا ہوگا، اس مین دس ہزار
سے زیادہ کتابین تھین، غازی الدین حیدر نے اس کو زیادہ ترقی دی،

ایک دوسرا کتب خانہ موتی باغ کے محل مین تھا، اس مین زیادہ تر ادبی کتابین تھین،
یہ محل آج بھی گومتی کے کنارے قیصر باغ سے تھوڑے فاصلہ پر موجود ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد باغیان قید
اس مین رہتے تھے، اب اس کا نام "موتی محل" ہوگیا ہے، اس محل مین تین ہزار سے زیادہ
کتابین تھین، جو زیادہ تر چیدہ اور منتخب تھین،

ایک اور کتب خانہ فرح بخش محل مین تھا، اس مین کتابین گو ایک ہزار سے کم تھین لیکن
قیمت کے لحاظ سے یہ بڑا بیش بہا کتب خانہ تھا، اس کتبخانہ کی ہر کتاب مطلا اور مذہب
تھی، اور یہ کتب خانہ نقاشی اور طلاکاری کا بہترین نمونہ تھا، واجد علی شاہ کے حکم سے یہ خاص کتبخانہ
عام شاہی کتب سے علحدہ جمع کیا گیا تھا۔ اس لیے اگر اس کو واجد علی شاہ کا ذاتی کتبخانہ
کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان سب کتب خانون کی حفاظت کا معقول انتظام تھا، اور ایک گونہ اچھی حالت
مین تھے، لیکن سلطنت کی سیاسی بدنظمی کا ان پر بھی کافی اثر پڑا، اور کتب خانہ کے ناظمون کی
جلد جلد تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ناظم کو اس کے ترتیب دینے کا موقع نہ مل سکا، دیواری
الماریون مین یہ کتابین بھری تھین، اور چونکہ ان مین کوئی ترتیب نہ تھی اس لیے افسران کتب خانہ
جائزہ لیتے اور دیتے وقت محض جلدون کا شمار کرا دیتے تھے، اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا
کہ بہت سی نایاب اور قابل قدر کتابین کتب خانہ سے نکل گئین اور جلد شماری کے لیے انکی

جگہ معمولی کتابین رکھ دی گئین، چنانچہ اسپرنگر لکھتا ہے کہ ناظم کتب خانہ نے دس ہزار قیمت کی کتابین فروخت کرکے اپنے لڑکون کی شادی کی، راقم الحروف نے بھی شاہی کتب خانہ کی مہر شدہ کتابین ہندوستان کے متعدد کتب خانون مین دیکھی ہین جس سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے، راجہ صاحب سلیم پور کے کتب خانہ مین ایسی متعدد کتابین آج بھی موجود ہین، شاہی کتب خانہ کی بقیہ کتابین ۱۸۵۸ء کے بعد لندن بھیج دی گئین،

زبان کے لحاظ سے ان کتب خانون مین عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، ترکی اور پشتو کی کتابین تھین، فنون کے لحاظ سے تصوف، تذکرہ، تاریخ کے ساتھ ادب کا بڑا ذخیرہ تھا، جس مین دواوین کا حصہ سب سے زیادہ تھا[1]

اودھ کے شاہی کتب خانہ کی نسبت جو کچھ لکھا گیا، یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ سلطنت دم توڑ چکی تھی، کتب خانہ تباہ و برباد ہوچکا تھا، اسپرنگر صاحب نے محض بچی کھچی کتابون کی فہرست تیار کی تھی، ورنہ عبد اللطیف شوستری نے جو آصف الدولہ کے عہد مین لکھنؤ آیا تھا، اپنے سفرنامہ مین لکھا ہے کہ

"علامی تفضل حسین خان کے ساتھ مین نے کتب خانہ کا معاینہ کیا، تقریباً تین لاکھ کتابین اس کتب خانہ مین موجود ہین، اور ہر سو جلد پر ایک آدمی مقرر ہے،

زبان کے اعتبار سے یہ کتب خانہ عربی، فارسی اور انگریزی کی نظم و نثر کی کتابون پر مشتمل تھا، خوشنویسون کے قطعات کے علاوہ ایرانی، ہندی، رومی اور یورپین مصوری کے بہترین نمونے اس کثرت سے اس مین ہین کہ ان سب کو دیکھنے کے لیے عمر نوح کی ضرورت ہے، علمی کتابون کے بے شمار نسخے دیکھنے مین آئے، جیسے شرائع، مدارک، مسالک، مفاتیح،

[1] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ مطبوعہ لندن۔

کشکول، بحار الانوار وغیرہ،

اس کتب خانہ مین مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابین بھی بہت ہین، مہتمم کتب خانہ نے بتایا کہ سات سو جلدین خود مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہین، دہلی کی سلطنت جب تباہ ہوئی تو وہان کے کتب خانہ کی کتابین زیادہ تر لکھنؤ کے اس شاہی کتب خانہ مین منتقل ہوگئین، حق یہ ہے کہ یہ کتب خانہ اس قدر نادر روزگار ہے، اور ایسا بیش بہا ہے کہ شاہی خزانہ کے جواہرات اس کے پاسنگ کو بھی نہین پہنچتے[1]

اس بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بارھوین صدی کے آخر مین شاہان اودھ کا کتب خانہ کتنا عظیم الشان اور اس کا انتظام کس قدر بہتر تھا، لکھنؤ مین ایک مشہور کتب خانہ مرزا سلیمان شکوہ کا تھا، مرزا سلیمان شکوہ دہلی کے بے بس بادشاہ شاہ عالم کے تیسرے بیٹے تھے ۱۲۰۵ھ مین قلعہ معلّی سے بھاگ کر لکھنؤ پہنچے،

لکھنؤ مین آصف الدولہ کی حکومت تھی، بڑی عزت کے ساتھ "ٹیڑھی کوٹھی" مین قیام کا انتظام کردیا، اور چھ ہزار ماہوار ان کے اخراجات کے لیے مقرر کردیے، مرزا سلیمان شکوہ بڑے علم دوست تھے، دہلی کے ارباب فن ان کے دربار مین آہستہ آہستہ جمع ہوگئے، خود بھی شاعر تھے، اور شاعرون کی قدر افزائی مین ہمیشہ ساعی رہے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی کتب خانہ مین شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے متعدد دیوان مصنف کے زیر ہدایت لکھے گئے تھے، جن کی پانچ جلدین اس وقت بھی کتب خانہ رامپور مین موجود ہین، اور مرزا سلیمان شکوہ کے کتب خانہ کی مہر اس پر لگی ہے،[2]

لکھنؤ کے ضلع مین کاکوری شرفا کا ایک مشہور قصبہ ہے، جہان برٹش گورنمنٹ کے

[1] تحفۃ العالم ص ۴۴۹، ۵۰۰ مطبوعہ بمبئی [2] فہرست کتب خانہ رامپور

کے عہد میں بھی عرصہ تک علم کا چرچا رہا، وہاں صاحب ذوق امرا کے سبب سے بہت سے علما، شعرا اور ادیب
رہتے تھے، اور ان ہی کے سبب سے مدارس، کتب خانے اور علمی مجلسیں قائم تھیں، ان ہی میں سے ایک
مقام "امیر محل تھا" جہاں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، اس کتب خانہ میں ایک "تذکرہ" بیاض
نور ازل" تھا، جس کو شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۲۰۹ھ میں تصنیف کیا تھا، اور اس کی نقل
در نقل ۱۲۳۹ھ میں ہوئی جو امیر محل کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، اور اسوقت کاکوری کے مشہور
نغز دوست شبیر احمد صاحب علوی بی، اے کے پاس موجود ہے،[1]

فرنگی محل کا کتب خانہ | صوبہ اودھ کے مشہور قصبات میں سے ایک "سہالی" بھی ہے، جہاں شیخ
نظام الدین انصاری مشہور عالم بزرگ سکونت پذیر تھے، اور ان کا فیض جاری تھا،
اکبر کے زمانہ میں ان کے پوتے شیخ حافظ نے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے علم کا غلغلہ
سنکر بادشاہ نے ازراہ قدردانی ان کے لیے جاگیر مقرر کر دی، ان کی چوتھی پشت میں ملا
قطب الدین ہوئے، یہ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ خود عالمگیر نے ان سے ملنے کی خواہش کی تھی،
جب ان کو دشمنوں نے شہید کر دیا، تو ان کے لڑکے ملا نظام الدین لکھنؤ چلے آئے، بادشاہ
نے ازراہ قدردانی فرنگی محل، جہاں پہلے پرتگیز تاجروں کی کوٹھیاں تھیں، ان کے قیام
کے لیے مرحمت کیا، ملا نظام الدین نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر وہ شہرت حاصل
کی جو خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا ہندوستان میں کم کسی کو نصیب ہوئی،
آپ نے جو مدرسہ فرنگی محل میں قائم کیا تھا وہ آگے چل کر عربی و دینی علوم کی ایک بڑی
عظیم الشان یونیورسٹی ہو گئی، اس کیلئے ایک کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا، خود ملا نظام الدین
کے زمانہ میں یہ کتب خانہ کس حیثیت کا تھا، اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں معلوم لیکن اسقدر

---

[1] رسالہ نگار ص ۳۴، جنوری ۳۱ء

علم ہے کہ ملا صاحب کے بعد ان کے جانشینوں نے اس کتب خانہ میں بڑا اضافہ کیا، یہانتک
کہ مولانا عبدالحی کے زمانہ میں مطابع کے اجرا سے اس میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا، معلوم
ہوتا ہے کہ مولانا کی وفات پر کتب خانہ کا نایاب حصہ تلف ہو گیا، راقم الحروف نے جب اس
کتب خانہ کو دیکھا تو اس میں فقہ کی کتابیں زیادہ تھیں، یہ کتب خانہ فی الحال یوسفی پریس کی دو منزلہ
عمارت کے مشرقی دالان میں ہے، بعض قلمی اور کچھ بند الماریوں میں کتابیں فن وار لگی ہیں، غالباً
یہ کتب خانہ اسی وقت کھلتا ہے، جب کوئی شائق اس کا مشتاق ہو،
مولانا عبدالباری صاحب کا کتب خانہ بھی نظر سے گذرا، اس میں زیادہ تر فقہ اور تصوف
کی کتابیں ہیں، یہ کتابیں ان کے دیوان خانہ میں محراب کے طاقوں اور دیواری تختوں پر ہیں، او
کچھ مخطوطات مدرسہ نظامیہ کی دوسری منزل میں کھلی الماریوں میں رکھی ہیں،
لکھنؤ میں ایک اور مشہور کتب خانہ تھا، جو وہاں کے مجتہد صاحب کے زیر اہتمام
قائم ہوا تھا، یہ کتب خانہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی مجتہد صاحب کے پاس رہا، راقم الحروف نے ایام طالبعلمی
میں جناب قبلہ علی صاحب مجتہد کے انتقال پر سنا تھا کہ ان کا کتب خانہ دوسرے مجتہد صاحب
کو دیدیا گیا، اس کے بعد قبلہ ناصر حسین صاحب مجتہد قرار پائے، آپ کا کتب خانہ لکھنؤ میں بہت
مشہور ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا تو اس میں دو قسم کی کتابیں تھیں، ایک وہ جو اصل
کتب خانہ میں پہلے سے چلی آ رہی ہیں ان پر قدیم کا لفظ لکھا ہوا ہے، دوسری وہ جو خود مجتہد صاحب قبلہ
نے اضافہ کی ہیں، ان پر جدید کا لفظ مرقوم ہے، قدیم کے لفظ سے خیال گذرتا ہے کہ شاید اس سے
مراد وہ کتابیں ہوں جو سلسلہ بہ سلسلہ مجتہدوں کو کتب خانہ کی شکل میں ملتی چلی آئی ہیں،

راجہ سلیم پور کا کتب خانہ | لکھنؤ کے قریب کے قصبوں میں ایک قصبہ "سلیم گڈھ" بھی ہے، جس کو آجکل
سلیم پور کہتے ہیں، شاہان اودھ کے عہد سے یہاں کے حکمران جو "راجہ" کے لقب سے مخاطب

کیے جاتے ہین، صاحب ذوق اور قدر دان علم و فن تھے، اور ان کو خیمون اور جواہرات کی طرح کتابون کا بھی شوق تھا، اس لیے ان کا لاجواب کتب خانہ قائم ہوگیا، اس کتب خانہ مین تقریباً ہر فن کی کتابین تھین، مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ تھا، بعض کتابین مصوری کا نمونہ تھین، فردوسی کے "شاہنامۂ مصور" کی قیمت دس ہزار تک آنکی گئی تھی، منظر الاعیان کا نسخہ تمام ہندوستان مین نادر کتاب کا حکم رکھتا ہے، حیدر آباد کے دیوانی کے کتب خانہ کے علاوہ دوسرا نسخہ اسی سلیم پور کے کتب خانہ مین ہے، لیکن بہت برے حال مین ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا تو باوجود حفاظت کے اس کی حالت ابتر تھی، جس عمارت مین یہ کتب خانہ ہے وہ اس قدر شکستہ ہے کہ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" کی مصداق ہو رہی ہے۔

کتابین بند المماریون مین ہین، اور ابھی تک بیشتر اچھی حالت مین ہین، گو حفاظت کا کوئی سامان نہین، اردو، فارسی، عربی تینون زبانون اور ہر فن کی کتابین ہین، فقہ، حدیث، تفسیر (شیعہ و سنی) اور ان کے اصول کی کتابین زیادہ ہین، تاریخ اور ادب کا ذخیرہ بھی کافی ہے، مخطوطات کتب سے علیحدہ توشہ خانہ مین کئی صندوقون مین بھرے ہین،

بلگرام کے کتب خانے لکھنؤ کے مضافات مین ایک مردم خیز خطہ قصبہ "بلگرام" بھی ہے، جہان قدیم عہد مین بڑے بڑے علماء، ادباء، حکماء اور صوفیہ پیدا ہوتے رہے، شیخ عبد الواحد، شیخ نظام، قاضی محمود، قاضی کمال، میر عبد الواحد، مفتی امیر حیدر، سید غلام علی آزاد بلگرامی، امیر عبد الجلیل بلگرامی، سید ڈاکٹر علی بلگرامی، نواب سید حسین بلگرامی جیسے اکابر اسی خاک کے درخشندہ ستارے تھے۔

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ بلگرام مین کیسے کیسے کتب خانے رہے ہون گے، جو دست برد زمانہ سے برباد ہو گئے، تاریخ کے مطالعہ سے چند کتب خانون کا حال معلوم ہوتا ہے،

(۱) قاضی ابو الفتح شیخ کمال فرشوری بلگرام کے اہل کمال مین تھے، ۱۰۱۰ھ مین پیدا ہوئے، اکبر اعظم کے عہد مین قاضی مقرر کیے گئے، اس دولت و وجاہت کے باوجود تمام عمر خدمت علم مین مصروف رہے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس مین صرف، نحو، منطق، حکمت، معانی، بیان، فقہ، اصول فقہ، تفسیر کا بڑا ذخیرہ تھا،

قاضی صاحب خود خوشنویس اور خطاط بھی تھے، اس لیے بڑی تعداد کتابون کی خود ان ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اکثر کتابون پر ایسے سیر حاصل حاشیے لکھے کہ پھر شرح کی ضرورت نہ رہی۔ کتابت مین صحت کا اتنا اہتمام رکھتے تھے کہ ایک نقطہ کی بھی غلطی نہ ہوتی تھی، آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام مین آپ کی تحریرون کو کمال صحت کے سبب صحف آسمانی کا خطاب دیا ہے، شیخ کمال نے چوراسی[۸۴] برس کی عمر مین ۱۱۰۱ھ مین وفات پائی، "شیخ کمال" تاریخ وفات ہے، انکے انتقال کے بعد کتب خانہ برباد ہو گیا، اور اکثر نادر کتابین بلگرام سے باہر چلی گئین۔[۱]

(۲) بلگرام مین ایک دوسرا کتب خانہ سید عبد الواحد بلگرامی کا تھا، یہ بھی بڑے خوشنویس تھے، مختلف فنون کی کتابین جمع کی تھین، اس کتب خانہ مین بے شمار نسخے کلام مجید کے تھے،

(۳) سید عبد اللہ بلگرامی اپنے زمانہ کے مشہور فضلا مین تھے، ان کو خوش خطی مین بھی کمال حاصل تھا، کاغذ کے پھول اچھے تراشتے تھے، طبع موزون رکھتے تھے، قابل تخلص تھا، ۱۱۳۲ھ مین وفات پائی، سید صاحب نے ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا، اس مین بڑی نادر اور عمدہ کتابین تھین، افسوس کہ ان کے بعد کتب خانہ نا اہلون کے ہاتھ لگا، اس لیے کتابین متفرق اور منتشر ہو گئین، اور یہ گوہر نایاب برباد ہو گیا،

(۴) علامہ سید عبد الجلیل بلگرامی کی ذات علمی حیثیت سے بہت بلند تھی، شہنشاہ عالمگیر

---

[۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۸

کے بعد وہ حکومت کے مختلف عہدون پر ممتاز تھے، جہان جاتے تھے علمی مشغلہ ساتھ لے جاتے، کتابون کے بے حد قدر دان اور شائق تھے، سفر مین اپنے ساتھ صرف ضروری کتابین رکھتے، باقی کتب خانہ بلگرام مین تھا، کتابین زیادہ تر اس عہد کے دستور کے مطابق صندوقون مین تھین، ایک خط مین سید محمد کو لکھتے ہین کہ برخوردار کتاب وضۃ الناظر اس صندوق مین رکھی ہے جو گجرات سے گھر پر لے آیا تھا۔

کتابون کی حفاظت کے متعلق لکھتے ہین "کتابون کی احتیاط کے بارہ مین کیا لکھون، آپ پر ظاہر ہے کہ مین کتابون کو کس قدر عزیز رکھتا ہون، اور کتنی محنت اور تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے، کبھی کبھی دھوپ بھی دکھا دیا کرین، اس کتب خانہ مین اردو، فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کی کتابین تھین، فنون کے اعتبار سے ادب، ادعیہ، حدیث، طب، لغت، فقہ، صرف نحو وغیرہ کی کتابین دوسرے فنون کے مقابلہ مین زیادہ تھین، میر عبد الجلیل نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر مین بمقام دہلی سنہ ۱۱۳۸ھ مین وفات پائی[۱]۔

میر صاحب کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک ان کی اولاد نے کتب خانہ کی حفاظت کی، لیکن پھر اس خاندان سے علمی ذوق گھٹتا گیا، تو آہستہ آہستہ کتابین فروخت کر دین، اور آج اس کا ایک ورق بھی بلگرام مین نہین ہے، لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان کتابون کا بڑا حصہ خصوصاً میر صاحب کی تصنیفات بلگرام سے منتقل ہو کر حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ مین داخل ہو گئین۔

(۵) علماے بلگرام مین شاہ طیب متوفی سنہ ۱۱۵۲ھ بھی مشہور لوگون مین تھے، وہ عرصہ دراز تک سلسلۂ ملازمت احمد آباد گجرات مین رہے، اپنے والد کے انتقال کے بعد

---

[۱] حیات جلیل ص ۲۶۱

خانہ نشین ہو گئے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، خود بھی بڑے زود نویس اور اعلیٰ پایہ کے خوشنویس تھے، اس کتب خانہ مین خوشنویسی کے اعلیٰ نمونے بکثرت تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہین "وکتب خانہ عظیمے از خط خوش نما خود یادگار گذاشت[۱]"۔

(۶) نواب شیخ میر عالمگیری صاحب ثروت ہونے کے ساتھ صاحب دل بزرگ تھے، بلگرام کے سیدواڑہ سے نکل کر شہر کے مشرقی جانب ایک محلہ آباد کیا، اور اس مین ضروریات کی تمام چیزین مہیا کین، کتابون کے بھی شائق تھے، چنانچہ ایک کتب خانہ بھی ان کے پاس موجود تھا، اسی محلہ مین مسجد تعمیر کرا رہے تھے کہ خود ان کی حیات مستعار کی تکمیل ہو گئی، مرتے وقت وصیت کر گئے کہ کتابون کو فروخت کر کے مسجد کی تکمیل کی جائے[۲]۔

والی فرخ آباد کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے آخری زمانہ مین روہیلون کی ایک ریاست فرخ آباد مین بھی قائم ہوئی تھی، یہان کے حکمران علم کے شائق اور اہل کمال کے بڑے قدر دان تھے، چنانچہ جو بڑے بڑے اصحاب کمال دہلی سے نکلتے تو ان کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی، سنہ ۱۲۷۳ھ مین یہان کا حکمران بدر الدولہ شجاع الملک محمد سعادتمند خان بہادر اسد جنگ تھا، جو سخاوت، شجاعت اور علوم و فنون کی قدردانی مین اپنے بزرگون کا خلف الصدق تھا، اس کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، چنانچہ ایک کتاب پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے:

"بتاریخ دوازدہم ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ مقدسہ روز جمعہ نسخہ مجالس العشاق بکتب خانہ نیاز مند درگاہ بدر الدولہ شجاع الملک محمد سعادت خان بہادر اسد جنگ بن نواب امین الدولہ محمد خرد مند خان بہادر ببر جنگ خلف الرشید نواب شمس الدولہ محمد خدا بندہ خان بہادر غضنفر جنگ والی ملک فرخ آباد داخل گردید"۔

---

[۱] ماثر الکرام ج ۱ ص ۳۰۵ [۲] ایضاً ص ۹۸

یہ کتاب آج کل ریاست رامپور کے کتب خانہ مین ہے [1]

نواب روہیلہ کا کتب خانہ | محمد شاہ بادشاہ کے عہد مین روہیلہ پٹھانون نے بڑی قوت پیدا کر لی، اور آہستہ آہستہ روہیل کھنڈ پر قابض ہو گئے، اس کے حکمرانون مین حافظ رحمت خان بڑا شجاع، بہادر، صاحب علم اور اہل کمال کا قدردان تھا، اس نے اپنے مختصر عہد حکومت مین بہت سے مدرسے قائم کیے، اور رفاہ عام کے دوسرے کام انجام دیے،

وہ سادات، علما، اور فضلا کا بڑا قدردان تھا، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، ۱۷۷۴ء مین اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کو قتل کر کے اس کی ریاست کو اپنی سلطنت مین شامل کر لیا، اور شاہی محل کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ [2]

اس لوٹ مین کتب خانہ بھی ہاتھ آیا، جس کو لکھنؤ لا کر توپ خانہ کی عمارت مین رکھا گیا، لکھنؤ مین عام طور پر اسکو توپخانہ لائبریری کہتے تھے، یہ توپ خانہ برٹش رزیڈنسی کے قریب تھا، (جس کو آجکل بیلی گارد کہتے ہین، جو دراصل بیلی گارڈن کا بگڑا ہوا نام ہے، میجر بیلی صاحب نواب سعادت علی خان کے عہد مین مشہور رزیڈنٹ تھے)، غالبًا یہ وہ مقام ہے جہان آجکل بلرام پور ہسپتال ہے، اور بیلی گارد کے سامنے جو بڑا میدان نظر آتا ہے وہ اس مین شامل تھا، اس میدان مین ایک بڑی دو منزلہ عمارت تھی، اس کے تین حصے فوجی ضروریات مین استعمال ہوتے تھے، اور چوتھے حصہ کی بالائی منزل مین یہ کتب خانہ تھا،

یہ کتابین صندوقون مین بڑی بے ترتیبی سے بھری ہوئی تھین، اسپرنگر صاحب نے ان کو کس مپرسی کی حالت مین دیکھ کر بہت افسوس کیا ہے، ان صندوقون مین مستقل طور پر جوہون نے سکونت اختیار کر لی تھی، اور ڈنڈون سے کھٹکھٹائے بغیر ان صندوقون مین

---

[1] تحقیق آثار قدیمہ کلکتہ حافظ نذیر احمد صاحب بحوالہ معارف ج ۱۴ [2] گل رحمت ص ۳۰، بمبئی

ہاتھ ڈالنا بڑا خطرناک کام سمجھا جاتا تھا،

کیڑون نے بھی کافی نقصان پہنچایا تھا، اچھی اچھی کتابین کیڑون کی ستم آرائی سے چھلنی ہو کر رہ گئین، ہفت قلزم اور تاج اللغات دونون جو اس عہد مین نایاب و نوادر مین شمار ہوتی تھین، برباد ہو گئین، اور اس قسم کی بے شمار کتابین جو ہون اور کیڑون کے نذر ہو گئین، اسکا سبب غالبًا یہ ہے کہ شجاع الدولہ کو روہیلون کے ملک، ان کی دولت اور ہیرے جواہرات کی ضرورت تھی جو بعد فتح حاصل ہو گئے تھے، فوجی سردارون نے ان تمام کتابون کو بیکار سمجھکر ایک کونہ مین ڈالدیا، جو بلا حفاظت اسپرنگر صاحب کے وقت تک پڑی رہین،

رام پور کا کتب خانہ | سلطنت مغلیہ کے اختتام پر روہیل کھنڈ مین جو ریاستین قائم ہو گئی تھین ان مین سے ایک رام پور کی ریاست بھی ہے، اس کے فرمانروا ہمیشہ سے علوم و فنون کے سرپرست رہے ہین،

دہلی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے پر اکثر اہل کمال رام پور آ گئے تھے جن کی نواب صاحب نے بھی پوری قدردانی کی اور علمی کامون کا دروازہ کھولدیا، اور ایک بڑا عربی مدرسہ قائم کیا گیا، جس کے صدر مدرس (پرنسپل) علامہ زمان مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی تھے، اسی کے ساتھ تصنیف اور ترجمے کا کام بھی شروع کیا گیا،

تاریخی تحقیقات سے جہان تک پتہ لگتا ہے، باقاعدہ طور پر کتب خانہ کی ابتدا نواب محمد فیض اللہ خان والی رامپور کے عہد مین ہوئی، اور تصنیف و تالیف و ترجمے اور نذر کے ذریعہ جتنی کتابین حاصل ہوئین وہ سب اس کتب خانہ مین جمع ہوئین،

نواب سید محمد سعید خان صاحب کے عہد (۱۸۴۳ء ۱۲۵۹ھ) مین ایک ہزار چار سو نواسی روپے آٹھ آنے کی کتابین خریدی گئین، اس وقت کتب خانہ مین ہمایون نامہ، اکبر نامہ، خزانۃ العلم

تاریخ نادری، خلاصۃ التواریخ، تاریخ جہان خانی، تاریخ مجمع محفل جیسی کتابین جو اس عہد مین نایاب تھین اس کتب خانہ مین موجود تھین،

نواب سید محمد یوسف صاحب کے زمانہ (۱۸۵۵ء) مین دو ہزار سات سو ستاون روپے ساڑھے دس آنے کی کتابین خرید کرکے داخل کتب خانہ کی گئین،

اس کے بعد نواب کلب علی خان کے عہد مین کتب خانہ کو بڑی ترقی ہوئی، اور تینتالیس ہزار چھ سو آٹھ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی کی کتابین خرید کی گئین، اس کے علاوہ دوران سال مین جو نایاب کتابین خریدی گئین ان کی قیمت اس مین شامل نہین ہے، جیسے تاریخ غازانی مصور جس کی قیمت دو ہزار تھی یا عجائب المخلوقات کا مصور نادر نسخہ وغیرہ،

نواب کلب علی خان کے بعد نواب حامد علی خان کے عہد مین چار لاکھ اٹھائیس ہزار ایک سو چھتیس روپے چودہ آنے، دس پائی کتب خانہ پر صرف ہوئے، جس مین سے چالیس ہزار کی رقم کتب خانہ کی عمارت پر خرچ ہوئی، بقیہ مین کتابون کی خریداری اور کتب خانہ کے عملہ کی سال بھر کی تنخواہ شامل ہے،

عملہ مین ناظم، مہتمم، رجسٹرار، نائب رجسٹرار، تحویل دار، خوش نویس، نقاش، وراق، صحاف، پاسبان، فراش وغیرہ ہوتے تھے، یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے، اس مین مندرجہ ذیل فنون کی کتابین ہین،

تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، فقہ، اصول فقہ، کلام، سلوک، اخلاق، حکمت، ہیئت، منطق، طب، لغت، نحو، بلاغت، ادب، تاریخ، سیر، مناقب، الحرب، کیمیا، اعمال متفرق،

مندرجہ ذیل زبانون کی کتابین اس مین موجود ہین:-

عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ترکی، پشتو، بھاشا، سنسکرت، ناگری اور

پنجابی کی کتابین ہین،

قدامت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قدیم کتاب ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی متوفی ۴۵۰ھ کی النکت والعیون ہے، جو ۵۵۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، کتابت کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم کتاب امام ابوالقاسم عبد الکریم بن ہوازن نیشاپوری متوفی ۴۶۵ھ کی التیسیر فی علم التفسیر ہے، جو جعفر بن عمر النصیر فی الحدادی کے ہاتھ کی ۶۹۰ھ کی لکھی ہوئی ہے،

خطاطی کی حیثیت سے دنیاے اسلام کے مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوئے کتبے بھی اس کتب خانہ مین موجود ہین، ایک کتاب دیوان الحادرہ بھی اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے،

اس کتب خانہ کے ابتدائی دور کی کوئی ایسی شہادت دستیاب نہین ہوئی جس سے اس بات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے کہ اس زمانہ مین کتابون کی تعداد کیا تھی، سب سے پہلی تحریر نواب کلب علی خان کے عہد کے مشہور شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی کی ملتی ہے، جو غالباً اس زمانہ مین کتب خانہ کے ناظم تھے، اس وقت (۱۸۸۹ء) کل کتابون کی تعداد ۴۸۹۳ تھی، اس کے بعد حکیم محمد اجمل خان اس کے ناظم مقرر ہوئے، انھون نے عربی کتابون کی ایک مفصل فہرست (جلد اول) مرتب کرائی، جس مین کتابون کی کل تعداد ۱۲۴۵۱ ہے، ۱۹۲۷ء مین اس کی دوسری جلد شائع ہوئی، اس زمانہ مین اس کتب خانہ کے ناظم حافظ احمد علی خان صاحب تھے، ان کی تحریر کے بموجب کتابون کی تعداد ۲۴۱۱۵ ہے،[۱] (باقی)

---

[۱] رام پور کے کتب خانہ کے متعلق تمام معلومات فہرست کتب خانہ رام پور جلد اول اور جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔

معانی القرآن للطبری

از

جناب ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی ریسرچ اسکالر ڈھاکہ یونیورسٹی

ستمبر ۱۹۶۳ء کے معارف مین "تفسیر طبری کی اہمیت" کے عنوان سے حقیر نے جامع البیان للامام الطبری پر کام کی نوعیت کا خاکہ پیش کیا تھا، جس سے اصحاب ذوق حضرات مین خاطر خواہ تاثر پیدا ہوا، گرامی قدر حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی و دیگر اکابر کے گرامی نامے کتاب معانی القرآن للطبری کے تقاضے اور اس ہیچمدان کی عزت افزائی مین موصول ہوئے، فالحمد للہ والشکر لہ،

راقم الحروف نے "معانی القرآن للطبری" پر کام شروع کیا تھا، اور اسی کی تالیف و تدوین مین ہمہ تن مصروف رہے،

معانی القرآن للطبری مین الفاظ قرآنیہ سے متعلق امام طبری کے لغوی مباحث کو جمع کر دیا گیا ہے، امام طبری نے الفاظ قرآنیہ پر کوئی مستقل تالیف نہین کی ہے، مگر اپنی تفسیر مین جہان وہ قرآن مجید کی تفہیم و تاویل مین آثار و روایات کا ذکر کرتے ہین، مفردات قرآنیہ کی تحقیق اور ان کے بیان مین محاورات عرب اور ائمہ لغت کے اقوال بھی بیان کرتے ہین، جن کو یکجا کر لینے کے بعد ایک خاصی ضخیم کتاب غریب القرآن کی تیاری ہو گئی ہے،

اعیان امت نے غریب القرآن پر الگ کتابین تصنیف کی ہین جنین سے اکثر و بیشتر نادر و نایاب ہین، ان مصنفین[1] مین ابو عبیدہ معمر بن المثنی، ابو عمر الزاہد، ابن درید (م ۳۲۱ھ)، امام راغب

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۱۳

اصفہانی، ابن الانباری، ابو بکر محمد بن عزیز سجستانی (م ۳۳۰ھ) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہین،

امام راغب کی کتاب مفردات القرآن مطبعہ میمنیہ مصر سے شائع ہو چکی ہے، اور علمی دنیا مین خاص قدر و منزلت رکھتی ہے، سجستانی کی کتاب جس کا نام نزہۃ القلوب و فرحۃ المکروب ہے، ۱۳۲۵ھ مین مطبعۃ السعادۃ مصر سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، یہ کتاب مختصر لیکن مفید ہے، اسی کتاب کو فخر الدین محمد بن علی النخعی الطریحی[1] نے جدید طور پر مرتب کر کے نزہۃ الخاطر و سرور الناظر نام رکھا ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک مین موجود ہے، ابن الانباری اور ان کے تلمیذ عزیزی (ابن عبد الملک المعروف بشیدلہ) نے پندرہ برس تک غریب القرآن پر کام کیا تھا، ان کی کتاب کسی زمانہ مین بہت مقبول و مشہور تھی، لیکن افسوس کہ دوسری کتابون کی طرح آج وہ بھی پردۂ خفا مین ہے، ابو حیان نے بھی غریب القرآن پر ایک مختصر رسالہ تالیف کیا تھا، جسکا ذکر امام سیوطی نے کیا ہے، ابن درید کی کتاب مکمل نہین ہو سکی تھی[2]، ان کے علاوہ کسائی (م ۱۸۲ھ)، زجاج (م ۳۱۰ھ)، فراء (م ۲۰۷ھ)، اخفش (م ۲۱۵ھ یا ۲۲۱ھ) وغیرہم کی کتابین معانی القرآن مین خاص اہمیت رکھتی تھین، لیکن اب یہ کتابین عنقا ہین، تاریخون مین صرف ان کا نام یا تذکرہ مل جاتا ہے، فراء کی کتاب اب تک عالم وجود مین ہے، اور ڈھاکہ یونیورسٹی مین اس پر کام ہو رہا ہے[3]، اس کتاب مین جستہ جستہ معانی الفاظ بھی مل جاتے ہین، البتہ نحوی مباحث کی کمی نہین، امام طبری نے جن کتابون کو پیش نظر رکھ کر اپنی تفسیر لکھی ہے، ان مین فراء کی کتاب بھی ضرور ہو گی، کیونکہ ان کی تفسیر

[1] معارف فروری ۱۹۴۲ء ص ۱۳۳ [2] مقدمہ کتاب الملاحن نیز معجم الادباء تذکرہ ابن درید،

[3] برادر معظم مولانا صغیر حسن معصومی ایم اے لکچرار عربی معانی القرآن للفراء پر کام کر رہے ہین،

ہیں اس کی عبارتیں جا بجا موجود ہیں، کہیں کہیں انھوں نے فراء پر تنقید بھی کی ہے، مثلاً قصر ھُن کی تفسیر میں فراء کا قول "وزعم بعض نحوی الکوفة"[1] کے ماتحت نقل کرکے اس کی تردید کی ہے، اگر فراء کی کتاب پیش نظر ہو تو واضح ہو جاتا ہے کہ بعض نحوی الکوفہ سے طبری کی مراد فراء ہوتا ہے،

امام سیوطی نے کتاب الاتقان میں نافع بن الازرق اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سوال[2] وجواب نقل کئے ہیں جن میں تقریباً ایک سو نوے[3] الفاظ قرآنیہ کے معانی مع شواہد حضرت ابن عباسؓ سے ظہور میں آئے ہیں، یہ مجموعہ سوال وجواب نہایت دلچسپ ہے، سائل مختلف الفاظ کے شواہد پوچھتا ہے، اور حضرت ابن عباسؓ "عرب عرباء" کے اشعار بطور شواہد پیش کرتے ہیں، البتہ ایک جگہ سوال وجواب میں بظاہر مطابقت نہیں معلوم ہوتی، نافع مِن حَمَاءٍ مسنون کے معنی پوچھتے ہیں تو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اَلْحَمَاءُ، السَّوَاد، والمسنون، المصوّر اس پر بھی سائل کو تشفی نہیں ہوتی، اور کلام عرب سے شاہد کا طلب گار ہوتا ہے، حضرت ابن عباسؓ حمزہ بن عبد المطلب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں،[4]

اَغَرُّ کان البدر شقة وجهه جلا الغیم عنه ضوءه فتبددا

ظاہر ہے کہ اس شعر میں نہ حماء کا لفظ ہے، اور نہ مسنون کا۔

اس مضمون میں معانی القرآن للطبری کے چند اقتباسات کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ شائقین علم کو امام طبری کی معانی القرآن کے مضامین کا اندازہ ہو جائے اس سے اس کتاب کی اہمیت اور دوسرے خصائص کی توضیح بھی ہو جائے گی، اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ تفسیر طبری صرف احادیث وروایات ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں لغات القرآن کی بے مثل تحقیقیں کثرت سے موجود ہیں،

---

[1] تفسیر طبری ج ۲ ص ۲۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۲۰، ۱۳۳ [3] اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۲۳،

علامہ حمید الدین فراہی نظام القرآن میں فرماتے ہیں،[1]

وقد أسس تفسیرہ لبعض العلماء علی الاحادیث کابن جریر الطبری الذی حکموا علی تفسیرہ انه لو یصنف مثله الخ،	بعض علماء نے احادیث پر اپنی تفسیر کی بنیاد رکھی، جیسے ابن جریر طبری جن کی تفسیر کے متعلق لوگوں کا فیصلہ ہے کہ ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی"، الخ

علامہ کی اس تحریر سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ طبری کی تفسیر میں صرف احادیث و آثار کی بھر ہے، اور زبان کی تحقیق برائے نام ہوگی، مگر یہ واقعہ ہے کہ جس طرح امام طبری نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں، اسی طرح لغوی ونحوی تحقیقات اور قراۃ و بلاغت کے مسائل کو بھی نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے،

مقدمہ تفسیر میں انھوں نے ایجاز، اقتصار، تصریح، کنایہ، اور دوسرے اسالیب کلام کو نمایاں کیا ہے، اور تفسیر میں قرآن کے اسالیب وخصائص کلامیہ کی تشریح کا وعدہ کیا ہے،[2] تفسیر کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا یہ وعدہ پورا بھی کیا ہے،

انھوں نے ابتدا میں مفردات قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے ان قرآنی الفاظ کے متعلق جو عرب وعجم کی زبان میں مشترک ہیں، مثلاً کِفْلَین، اَوِّبِی، قَسْوَرَۃ، سِجِّیل[3] وغیرہ جن کے متعلق روایتیں

---

[1] مقالہ امین احسن اصلاحی معارف ص ۸۸، فروری ۱۹۴۲ء [2] تفسیر طبری اول ص ۱ [3] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ابن ابی حاتم اور امام طبری نے تخریج کی ہے کہ کِفْلَین حبشی زبان میں ضعفین کے معنی میں آتا ہے، طبری ج ۲۸ ص ۱، جلد ۱ ص ۱۲۹، آیت یہ ہے: یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (۲) عمر بن شرحبیل سے منقول ہے کہ اَوِّبِی حبشی کی زبان میں سبّحی کے معنی میں آتا ہے، اتقان جلد ۱ ص ۱۳۷، آیت یہ ہے: یَا جِبَالُ اَوِّبِی مَعَهٗ الخ (۳) امام طبری نے حضرت ابن عباسؓ سے تخریج کی ہے کہ قسورۃ حبشی زبان میں اسد کو کہتے ہیں قال اللہ تعالیٰ

سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ عجمی ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو اہل عجم سے عربوں نے یا اہل عرب سے عجمیوں نے اخذ کیا، اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے[۱]

بل الصواب فی ذلک عندنا	میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ (ایسے) لفظ
ان یسمی عربیا اعجمیا او	کو عربی عجمی یا حبشی عربی کہا جائے اسلئے
حبشیا عربیا اذ کانت الامتان	کہ دونوں قومیں (عرب وعجم) بول چال
لہ مستعملین فی بیانہا[۲]	اور روزمرہ میں ایسے الفاظ (جو عرب و
ومنطقہا استعمال سائر	عجم میں مشترک ہیں) کو اپنی زبان کے الفاظ
منطقہا وبیانہا، الخ	کی طرح استعمال کرتی ہیں، الخ،

اس سے ظاہر ہوا کہ ان مشترک الفاظ کو امام طبری توارد اللغات پر محمول کرتے ہیں، اکثر ائمہ واعیان کا یہ مسلک ہے کہ قرآن مجید میں کوئی معرب لفظ نہیں، امام شافعی، امام طبری، قاضی ابوبکر، ابن فارس، ابن ادریس، ابوعبیدہ وغیرہم کا یہی قول ہے[۳]، لیکن امام سیوطی[۴] جوینی ابن النقیب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۳) ذرۃ من قسورۃ (۴) مجاہد سے فریابی نے تخریج کی ہے کہ سجیل فارسی لفظ ہے، (اتقان ج ۱ ص ۱۳۸)، حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ سجیل "سنگ و گل" کی تعریب ہے، مقدمہ طبری ص ۶، آیت یہ ہے، ترمیہم بحجارۃ من سجیل الخ [۱] مقدمہ تفسیر طبری ص ۶ [۲] متن میں "بیانہا" کی جگہ "فیانہا" ہے [۳] ملاحظہ ہو الاتقان، النوع الثانی والثلاثون ج ۱ ص ۱۳۵-۱۳۱ [۴] ان بزرگوں کی بڑی دلیل حضرت ابومیسرہ تابعی کے یہ الفاظ ہیں، فی القرآن من کل لسان، حضرت سعید بن جبیر اور وہب بن منبہ سے بھی ایسے اقوال منقول ہیں، (الاتقان جلد ۱ ص ۱۳۶) ابومیسرہ اور سعید بن جبیر کے الفاظ امام طبری نے بیان کئے ہیں (مقدمۂ تفسیر ص ۶) ان اقوال کی توجیہ امام طبری اس طرح کرتے ہیں،

یعنی واللہ اعلم ان فیہ من	قرآن پاک میں ہر زبان کے ہونے کا

وغیرہم کا مسلک جدا ہے، ان کے نزدیک قرآن میں بہت سے معرب الفاظ موجود ہیں، اس موضوع پر امام سیوطی کی المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب مستقل تصنیف ہے، قاضی تاج الدین ابن السبکی نے ستائیس معرب لفظوں کو نظم کیا ہے، اُن کی نظم پر حافظ ابن حجر نے چوبیس الفاظ نظم میں اور بڑھائے اور سیوطی نے ساٹھ سے زائد معرب الفاظ کا اضافہ کیا ہے،

اس تبصرہ کے بعد ذیل میں معانی القرآن للطبری کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے کہ امام طبری کی تحقیق انیق کا صحیح اندازہ ہو، فٹ نوٹ میں ضروری تعلیقات درج کی جائیں گی،

(۱) وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل
لتکونوا شہداء علی الناس	بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور
ویکون الرسول علیکم شہیدا	رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام)
(البقرہ: پ ۲)	تم پر گواہ بنیں ط،

وامّا الوسط الخ کلام عرب میں وسط، خیار کے معنی میں آتا ہے، کہا جاتا ہے، فلان واسط الحسب فی قومہ" یعنی فلاں اپنی قوم میں واسط الحسب (بلند مرتبہ) ہے، یا کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴) کل لسان اتفق فیہ	یہ مطلب ہے کہ اس میں ایسے الفاظ موجود
لفظ العرب ولفظ غیرہا من	ہیں، جو عرب اور غیر عرب کی زبانوں میں
الامم التی تنطق بہ (مقدمہ ص ۸)	بطور توارد کے بولے جاتے ہیں" واللہ اعلم"

ابوعبید قاسم بن سلام کا قول یہ ہے کہ بہت سے عجمی الاصل الفاظ تعریب کے بعد خالص عربی میں مخلوط ہو کر عربوں کے روزمرہ میں داخل ہو گئے، ایسے الفاظ کو قرآن نے بھی استعمال کیا ہے، انہیں الفاظ کو عربی کہنا بھی صحیح ہے، اور عجمی کہنا بھی، یہ قول نہایت ہی مناسب اور صحیح ہے، جوالیقی اور ابن الجوزی کا میلان بھی اسی طرف ہے، (اتقان جلد ۱ ص ۱۳۷)

ھُوَ وَسَطُ فی قومہٖ۔ وسط اور واسط دونوں کے معنی ایک ہیں، جیسے مثانۃ یا بسۃ اللبن، اور یبیسۃ اللبن، دونوں ہم معنی ہیں، قرآن پاک کی آیت ہے، فَاضْرِبْ لَھُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (طٰہٰ: پ۱۶، یَبَسًا، یابسًا کے معنی میں ہے) اور زہیر بن ابی سلمیٰ کا قول ہے:

ھُمْ وَسَطٌ تَرْضَی الْاَنَامُ بِحُکْمِھِمْ   اِذَا نَزَلَتْ اِحْدَی اللَّیَالِیْ بِمُعْظَمِ

قَالَ دَانَا اَرِیْ الخ میرے خیال میں یہاں وسط درمیانی حصہ کے معنی میں ہے، جیسا کہ وسط الدار گھر کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں، اس معنی کی تقدیر پر وسطًا کی سین متحرک ہوگی، اور اس کی تخفیف جائز نہ ہوگی، اب امۃً وسطًا کے یہ معنی ہوں گے، کہ یہ امت افراط و تفریط سے پاک توسط و اعتدال پر واقع ہے،

کلام عرب میں لفظ وسط کے معنی و استعمال کی تفتیش کے بعد امام طبری احادیث و آثار میں اس کے معنی تلاش کرتے ہیں، فرماتے ہیں، وسط کی تاویل آثار و روایات میں عدل آئی ہے، اور خیار کا بھی یہی مطلب ہے، اس لئے کہ اسی شخص کو خیار (بہتر، برگزیدہ) کہا جاتا ہے، جو عدول (معتدل، میانہ رو) ہو حضرت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے وَسَطًا کے معنی عدولًا بیان فرمایا ہے، اسی طرح امام طبری نے تقریبًا تیرہ (۱۳) حدیثیں مرفوع و غیر مرفوع

ف تفسیر میں زہیر بن ابی سلمیٰ ہو ش دیوان زہیر ص ۱۲ اشعار اس طرح ہیں لحی حلال یعصم الناس امرھم اذا طلعت احدی اللیالی بمعظم شرح الزوزنی ص... وفیہ طرقت بدل طلعت "ھُمْ وَسَطٌ" کی روایت تفسیر کبیر میں موجود ہے جلد ۲ (ص ۹) لیکن اس میں بمعظم کی جگہ نفذا کم ہے، جو طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، البتہ تفسیر نیشاپوری بر حاشیہ طبری جلد ۲ ص ۱۰ اس میں بمعظم کی جگہ موصد ہے یہ بھی طباعت کی غلطی ہے، اس کی روایت "ھُمْ وَسَطٌ الخ" ہے، ف قائل امام طبری کے کوئی تمیذ ہیں ف وَسَط اور وَسْط پر ابو محمد بن بری نے سیر حاصل بحث کی ہے ملاحظہ ہو لسان العرب جلد ۹ ص ۳۰۷ ف ائمہ لغت میں سے جوہری، اخفش، خلیل، اور قطرب نے وسط کے معنی عدل کے بیان کئے ہیں، تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۹، فراء نے بھی یہی معنی بتایا ہے، ملاحظہ ہو معانی القرآن للفراء ص ۸۳

نقل کی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ وسط عدول کے معنی میں ہے[1]

(ب) مَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا، (البقرۃ: پ۲)
جو (شخص) خانۂ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں (صفا و مروہ) کا طواف کرے،

و انما یعنی تعالیٰ ذکرہ الخ: اَوِ اعْتَمَرَ سے مراد "اَوِ اعْتَمَرَ البیت" ہے "اعتمار کے معنی زیارۃ" ہیں، اس شخص کو جو کسی چیز کا قصد کرتا ہے، مُعْتَمِر کہتے ہیں، عجاج کہتا ہے،

لَقَدْ سَمَا ابْنُ مَعْمَرٍ حِیْنَ اعْتَمَرْ   مَغْزًی بَعِیْدًا مِنْ بَعِیْدٍ وَضَبَرْ (ط ۲/۴۰۴)

اس شعر میں اِعْتَمَرَ، قَصَدَ و اَمَّ کے معنی میں ہے،

(ج) وَلَا تَسْاَمُوْٓا اَنْ تَکْتُبُوْہُ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا اِلٰٓی اَجَلِہٖ (البقرۃ: پ۳)
اور کاہلی نہ کرو لکھنے میں چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا اس کے میعاد تک،

و معنی قولہ الخ لَا تَسْاَمُوْا کے معنی یہ ہیں کہ کاہلی نہ کرو، یا تنگ نہ آجاؤ، اسی سے کہا جاتا ہے، سَئِمْتُ فانا اَسْاَمُ سَاٰمَۃً و سآمۃ (زہیرؓ) کا شعر ہے،

سَئِمْتُ تکالیف الحیاۃ ومن یعش   ثمانین عامًا لا اَبَا لَکَ یَسْاَمِ (ط ۲/۸۰)

اس شعر میں سَئِمْتُ کے معنی ہیں، مَلَلْتُ (میں تنگ آگیا)

ف یہ روایتیں مجاہد، عطا، ابن عباس، ابو ہریرہ وغیرہم کی ہیں ف نزہۃ القلوب للسجستانی ص ۳۲ دیوان عجاج ۱۹/۱۱، ارجاز اس طرح ہیں:

لقد سما ابن معمر حین اعتمر   کما سما لیلۃ البدر القمر
مغزی بعیدا من بعید و ضبر   من محنۃ الناس التی کان انتظر

ایک روایت میں لقد غزا ابن معمر ہے تہذیب الالفاظ لابن السکیت ص ۵۲۳، لسان العرب ۶/۲۸۳

(د) قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران : پ) — کہا "حواریون" نے ہم لوگ اللہ کے انصار ہیں"

وبما الحواریون الخ:۔ علمائے تفسیر کے اقوال اس باب میں مختلف ہیں کہ "حواریون" کو حواری کہنے کی وجہ کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ "حواریون" سفید پوش تھے، اسی لیے "حواری" کہلائے حضرت سعید بن جبیر سے یہی روایت ہے، بعض کہتے ہیں کہ "حواریون" غسال[۵] تھے، کپڑے دھویا کرتے تھے، یہ روایت ابو ارطاۃ کی ہے، بعض کہتے ہیں "حواریون" سے مراد انبیاء علیہم السلام کے خاص مقربین ہیں، روح بن القاسم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قتادہ نے آنحضرت صلعم کے کسی صحابی کا ذکر کیا، تو کہا وہ "حواریین" سے تھے، قتادہ سے پوچھا گیا "حواریون" کون تھے، تو انھوں نے جواب دیا، "الذین تصلح لھم الخلافۃ" وہ لوگ جو نبی کی جانشینی کے لائق ہوں، ضحاک نے اس کی تفسیر کی ہے، "اصفیاء الانبیاء" یعنی انبیاء کے خاص برگزیدہ اصحاب،

ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد امام طبری فرماتے ہیں: مذکورہ بالا اقوال میں اشبہ یہ ہے کہ حواریون صاف کپڑے پہنتے تھے، اور کپڑے صاف کیا کرتے تھے، کلام عرب میں "حور" شدت بیاض کو کہتے ہیں اور اسی سے "طعام حواری" کو حواری کہتے ہیں کہ اس کا رنگ صاف ہوتا ہے، اور ایسے آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) ابن معمر کا نام عمر بن عبید اللہ بن معمر التیمی ہے جس نے خوارج سے جنگ میں نام پیدا کیا تھا، (تعلیق خطیب تبریزی بر تہذیب الالفاظ) تفسیر میں "مغل" بالراء المہملۃ اور "صبر" بالصاد المہملۃ سے یہ طباعت کی تصحیف ہے۔ [۱۲] اصل نسخہ تفسیر میں یہ شعر لبید کی طرف منسوب ہے، اور اس طرح ہے:

ولقد سئمت تکالیف الحیوۃ ومن — یعش ثمانین عاما لا أبا لک یسأم

یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، ایک یہ کہ شعر زہیر بن ابی سلمی کا ہے نہ کہ لبید کا، دیوان زہیر [۱۲] اور اسکے مشہور معلقہ کا شعر ہے، دوسرے یہ کہ شعر نسخہ مطبوعہ میں مصحف ہے، "عاما" کی جگہ "حولا" روایتوں میں عام ہے۔

[۱] ضحاک سے منقول ہے کہ نبطی زبان میں غسال کو حواری کہتے ہیں، (گویا حواری معرب لفظ ہے) تفسیر نیشاپوری ۲/۱۹۰، اس قول کی تخریج ابن ابی حاتم نے کی ہے، الاتقان ۱/۱۳۶

کو جس کی آنکھیں صاف و شفاف ہوں "احور" اور عورت کو "حوراء" کہتے ہیں،

ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا یہ لقب ابتداء میں اس لیے ہوا ہو کہ وہ کپڑے صاف کیا کرتے تھے، بعد میں ان پر لفظ حواری کا اطلاق ہونے لگا، رفتہ رفتہ اس کا استعمال اس قدر عام ہو گیا کہ ہر شخص اپنے خالص دوست کو "حواری" کہنے لگا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:[۱] ان لکل نبی حواریا وحواری الزبیر (ہر نبی کے خاص و مقرب رفیق تھے، میرے رفیق زبیر ہیں)

اہل عرب شہری عورتوں کو "حواریات" کہتے ہیں، چونکہ ان کا رنگ صاف ہوتا ہے اور انکی طبیعتیں نظافت پسند ہوتی ہیں، ابو جلدۃ یشکری کہتا ہے:

فقل للحواریات یبکین غیرنا[۲] — ولا تبکنا الا الکلاب النوابح

(طبری ۳/۱۸۱-۱۸۲)

(ک) وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ (آل عمران : پ) — بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم جاؤ اللہ والے

اما قولہ کونوا ربانیین:۔ ابو رزین، حسن، قتادہ، ضحاک، ابن عباس، سعید بن جبیر، سُدی[۳] اور مجاہد کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ "ربانیین" سے مراد علماء، فقہا و اتقیاء ہیں، مجاہد کے الفاظ یہ ہیں، الربانیون الفقھاء العلماء وھم فوق الاحبار۔ ابن زید کہتے ہیں کہ "ربانیون" کے مراد ولاۃ الامر ہیں، "لولا ینھاھم الربانیون والاحبار" کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ "ربانیون" سے مراد ولاۃ اور "احبار" سے مراد علماء ہیں۔

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد امام ابو جعفر الطبری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اولیٰ الاقوال بالصواب یہ ہے کہ "ربانیون" ربانی کی جمع ہے، یاء نسبت کی ہے، "ربان" اس کو کہتے ہیں جو لوگوں کی تربیت اور انکے امور کی دیکھ بھال کرے، علقمہ بن عبدہ کا شعر ہے:

وکنت امرأ افضت الیک ربابتی[۴] — وقبلک [ربتنی] فضعت ربوب

---

[۱] یہ "متفق علیہ" حدیث ہے، مشکوۃ المصابیح ص ۵۰۰ [۲] لسان العرب ۵/۲۹۹، شواہد الکشاف ص ۲۲، حماسۃ ابن الشجری ص ۶۵ [۳] سدی تکلم فیہ لیکن لاباس بہ کے درجہ میں ہیں، یہ نسائی کا قول ہے (حاشیہ التعویل) [۴] دیوان علقمہ ص ۴، دیوان میں "کنت" کی جگہ "انت" ہے، ایضاً تفسیر طبری ۱/۴، مطبوعہ تفسیر میں "ربتنی" کی جگہ "ربتی" ہے۔

شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ "اے ممدوح تجھ سے پہلے خبرگیری کرنے والوں نے میری تربیت و خبرگیری کی لیکن وہ مجھے سدھار نہ سکے بلکہ میں برباد ہوگیا"۔

عرب کا محاورہ ہے، ربّ مری فلان فھو یربّہ ربًّا وھو رابّہ

اسی سے ربّان[1] مبالغہ کا صیغہ ہے، جیسے "نعس ینعُسُ" سے "نعسان" آتا ہے:

(ایک قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں) اکثر وہ اسماء فعلان کے وزن پر آتے ہیں جنکا ماضی فعِل (بکسر العین) کے وزن پر آتا ہے، مثلاً سکر یسکر، عطِش یعطش، رَوِیَ یروٰی کے اسماء سکران، عطشان، ریّان ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ افعال، فعَل (نصر ینصر) کے وزن پر آتے ہیں، اور ان کے اسماء فعلان کے وزن پر، مثلاً [نعَسَ ینعُسُ][2] اور ربّ یربُّ کے اسماء۔

بعد اللتیا والتی، "ربانیون" میں وہ سب شامل ہوں گے جو صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور علم و فقہ کے حامل اور اپنے علم و فہم سے امت کی تثقیف و تربیت میں سرگرم ہوں، والی عادل بھی ان میں شامل ہوگا، غرض ربانیون وہ لوگ ہیں جو علم و فقہ اور دینی و دنیوی امور میں امت کے مرجع و عماد ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجاہد کہتے ہیں "ھم فوق الاحبار" (یعنی ربانیون احبار سے اونچا درجہ رکھتے ہیں) پس احبار سے مراد علماء ہیں اور "ربانی" وہ شخص ہے جو علم و فقہ کے ساتھ سیاست و تدبیر منزل، رعیت کی بہبودی اور امت کی دینی و دنیوی صلاح میں بصیرت و درک رکھتا ہو،

---

[1] سیبویہ کا قول ہے کہ ربانی "رب" کی طرف منسوب ہے، اور الف و نون کمال صفت پر دلالت کرنے کیلئے زیادہ کیے گئے ہیں، جیسے لحیانی جمانی، رقبانی وغیرہ بھی قبیل سے ہیں، مبرد کا قول ہے کہ ربّان کے الف و نون مبالغہ کے لیے ہیں جیسے غریان، عطشان، ریان وغیرہ۔ دیکھو الکبیر ۲/۲۴، نیشاپوری ۲/۲۲۲۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ ربانی اجنبی لفظ ہے، اہل عرب اسکو نہیں جانتے، جوالیقی کہتے ہیں کہ یہ عبرانی یا سریانی لفظ ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ عربی ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی ۲/۲۱۶، اتقان ۱/۱۳۶، نیشاپوری ۳/۲۲۲ [2] مطبوعہ تفسیر میں "نفس ینفس" ہے، دیکھئے طبری ج ۳ ص ۲۱۳

(و) یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ — تم پر بھیجا جائے گا آگ کا شعلہ اور دھواں، پھر تم مقابلہ نہیں کرسکتے،

وھولھبھا الخ:- "شواظ" آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہیں ہوتا، رؤبۃ بن العجاج کا شعر ہے:-

اِنَّ لَہُمْ مِنْ وَقْعِنَا [اقیاظًا][1] ونار حرب تسعر الشواظا

مجاہد کہتے ہیں "الشواظ ھو اللھب الاخضر المنقطع من النار یعنی شواظ" اس سبز شعلے کو کہتے ہیں جو جدا ہو، سفیان اور ضحاک وغیرہ سے بھی ایسی ہی روایتیں منقول ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ "شواظ" شعلہ دار دھواں ہے (طبری ج ۲۷)

(ز) نُحَاسٌ: حضرت ابن عباسؓ اور سعید کی روایت یہ ہے کہ "نحاس" سے مراد دخان ہے۔ اور بعض کہتے ہیں "نحاس" "صفر" (تانبا) کو کہتے ہیں لیکن میرے نزدیک اولیٰ یہ قول ہے کہ نحاس سے مراد دخان ہے، اسلیے کہ اس سے پہلے کی آیت میں یہ مذکور ہے کہ تم پر شواظ بھیجا جائیگا، "شواظ" دہکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دھواں نہ ہو، لیکن یہ مقام تہدید و وعید کا ہے، لہٰذا موقع و محل کا تقاضا یہ ہے کہ "شواظ" کے ساتھ "دخان" کا بھی ذکر کیا جائے کہ مزید تہدید ہو، اسلیے کہ وہ آگ (شواظ) غیر عادی طور پر دخان کے ساتھ ہوگی، اہل عرب نُحاس (بضم النون) اور نِحاس (بکسر النون) دخان کو کہتے ہیں لیکن قراء بالاتفاق نحاس بضم النون پڑھتے ہیں، نحاس بمعنی دخان، نابغہ بنی جعدہ[2] نے استعمال کیا ہے:

[یضئ] کضوء سراج السلیط[3] لم یجعل اللہ فیہ نحاسا

(ط ۲۷/۳)

نحاسا یعنی دخانا،

---

[1] لسان العرب ۹/۳۲۶ تفسیر میں "اقیاظًا" کی جگہ "مجناطا" ہے۔ شواظ بضم الشین و بکسرہا، بالکسر حسن کی قراءۃ ہے، اسکی نظیر صُوار اور صِوار ہے۔ قالہ الفراء فی المعانی ص ۱۰۹، ایضاً لسان ۹/۳۲۶ [2] ابن برزخ نے نحاس بضم النون اور نِحاس بالکسر میں فرق بتایا ہے، کہ بالضم صفر کو کہتے ہیں اور بالکسر دخان کو۔ اللسان ۸/۱۱۲ [3] شواہد الکشاف شرح تنبیہ الالفاظ ۲۳، اللسان ۸/۱۱۲، معانی الفراء ۱۵۹، وفیہ بلا عزو، وایضاً فی الاتقان ۱/۱۳۳ بلا عزو، تفسیر میں "یضئ" کی جگہ "تضئ" ہے، ایک روایت ہے کہ مثل سراج السلیط، اللسان ۹/۱۹۳ یعنی کی ضمیر وجہ کیطرف جو پہلے شعر میں مذکور ہے:

اضاءت لنا النار وجہا اغر ملتبسا بالفواد التباسا (تہذیب الالفاظ)

(ح) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (واقعہ) اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے،

یقول تعالیٰ ذکرہ فتت الجبال فتا الخ یعنی پہاڑ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے "دقیق مبسوس" کی طرح، دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے، "وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا" (المزمل: پ۲۹) یعنی پہاڑ بھربھرے ریت کی طرح ہو جائیں گے،

اہل عرب گندھے ہوئے ستو یا میدہ کو بسیسة[۵] کہتے ہیں اور سفر میں اسی کو زاد راہ بناتے ہیں۔ بنی غطفان کے ایک راہزن کا واقعہ ہے کہ روٹیاں پکانے کی فکر میں تھا، لیکن پکڑے[۶] جانے کے خوف سے گندھے ہوئے میدہ ہی کو کھا کر چلتا ہوا، اسی کا رجز ہے:-

لا تخبزا خبزا وبُسّا بسًّا　　مَلسًا [بذود الحُمَسِيِّ][۷] ملسا (طبری ۲۷/۱۰۴)

---

[۵] اصمعی کا قول ہے: ہر وہ چیز جس میں پانی یا "رُب" ملا دیا گیا ہو "بسیسة" کہی جاتی ہے، تہذیب الالفاظ: ۶۳۶

بعض کہتے ہیں کہ خشک روٹی کو چور کر کے کسی رقیق چیز کے ساتھ ملاتے ہیں، اسی کو بسیسة کہا جاتا ہے، اللسان ۴/۳۲۳

[۶] یہ بیان ابو عبیدہ کا ہے، اللسان: لفظ (لبس) [۷] تفسیر میں "بذود الحمسی" کی جگہ "مدودا محلسا" ہے، تصحیف ہے، تہذیب الالفاظ میں اس کے ساتھ دو شعر اور ہیں جن سے واقعہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

نومت عنهن غلاما جبسا　　وقد تغطى فروة وحلسا

من غدوة حتى كان الشمسا　　بالافق الغوري تكسى الورسا (ص ۶۳۶)

"الحمسی" حمیس بن اُد کی طرف نسبت ہے، ایک روایت میں بذود الحدسی ہے، لسان العرب ۷/۲۴، بنو حدس ایک یمنی قبیلہ کا نام ہے، خطیب تبریزی نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے (تہذیب الالفاظ) بعض روایتوں میں بذود الحلسی بھی ہے، اللسان ۸/۷، معانی الفراء: ص ۱۹۱، پہلا مصرعہ بعض روایتوں میں اس طرح ہے: لا تخبزا خبزا ونسا نسًّا۔ خبزا ونسا (بفتح الخاء المعجمة والنون فيهما) اونٹ کی دو چالیں ہیں، خبز بہ نسبت "نس" کے سست چال ہے، گویا راجز کہتا ہے کہ تیز بھاگو، ملاحظہ ہو، تہذیب الالفاظ و لسان العرب ۸/۳۲۴، دوسرے مصرعہ کی روایت اس طرح بھی ہے:

ولا تطيلا بمناخ حبسا (اللسان ۷/۳۲۴-۳۲۵)

اس قصہ کے متعلق تبریزی کا بیان ہے کہ بنی مرہ بن عوف بن غطفان کا ایک شخص کسی جگہ گیا تو چور لیا، اس نے اسے تنبیہ کیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہے تم میرا ساتھ چھوڑ دو، اس کے بعد گھی اور دم کی تنبیہ ہو، غطفانی کر سوتی ملا، دو گھی کے اونٹ ہانکتا اور رجز پڑھتا ہوا بھاگا۔

(ط) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ق (الدہر: پ۲۹)　　ہم نے پیدا کیا انسان کو نطفے جو چند چیزوں سے ملا ہوا تھا،

اَمْشَاجٌ، "اخلاط" کے معنی میں ہے، اس کا واحد مَشَج اور مَشِيج ہے، خِلْط اور خَلِيط کے وزن پر، رؤبة العجاج کا رجز ہے:

يطرحن[۱] كل معجل نشاج　　[لم يكس جلدا] من دم امشاج

جب ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملاتے ہیں تو کہا جاتا ہے: مشجت هذا بهذا شئ مخلوط کو ممشوج اور مشیج کہتے ہیں، ابو ذویب کہتا ہے،

كأن الريش[۲] والفوقين منه　　خلاف النصل نيط به مشيج (طبری ۲۹/۱۰۸)

(ی) لَابِثِيْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا (النبا: پ۳۰)　　وہ اس میں مدتوں پڑے رہیں گے۔

أحقابا: احقاب حُقُب کی جمع ہے اور حقب، حقبة کی، شاعر کہتا ہے:-

[وكنا[۳] كندمانى جذيمة حقبة　　من الدهر حتى قيل لن يتصدعا

اسی (یعنی حقبة) کی جمع "حقب" ہے جو "احقاب" کا واحد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: او اَمْضِيَ حُقُبًا (الکہف: پ۱۶) (طبری ۳۰/۷)

---

[۱] دیوان رؤبہ: ۳۲/۱۳، اراجز اس طرح ہیں:-

حتى مسيناهن بالاخداج　　يقذفن كل معجل نتاج

لم يكس جلدا من دم امشاج　　فرج عنه حلق الرتاج

اصل نسخہ میں "يقذفن" کی جگہ "يطرحن" اور "لم يكس جلدا" کی جگہ "لم يكتس خلدا" ہے،

[۲] سمط اللآلی: ص ۹۵، اس کی روایت میں "نیط" کی جگہ "سیط" ہے، اصمعی کا قول ہے کہ یہ شعر المدخل زہیر بن حرام کا ہے جو بنی سہم بن مرہ سے تھا، اور جمحی، ابو عمرو ابن الاعرابی سے سکری نے نقل کیا ہے

(باقی حاشیہ ص ۲۶۴ پر)

یہ چند اقتباسات اصحاب ذوق کے تفنن طبع کے لیے "معانی القرآن للطبری" کے مختلف مقامات سے چن کر ترجمہ کی صورت میں پیش کئے گئے، ساری کتاب ایسی ہی تحقیقات سے بھری ہوئی ہے، اسانید و مکررات بخوف طوالت اصل کتاب سے حذف کر دیے گئے ہیں البتہ اسانید مع تحقیق فٹ نوٹ میں ثبت کر دیے گئے ہیں، تاکہ عموم فائدہ فوت نہ ہو جائے،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) کہ یہ شعر عمر بن الداخل کا ہے (سمط) ۵۳ اصل کتاب میں "وکنا" کی جگہ "عشنا" یہ شعر متمم بن نویرہ کا ہے: الشعر والشعراء لابن قتیبۃ: ۱۲ اس شعر کے بعد ہی یہ شعر ہے،

فلما تفرقنا کانی ومالکا   لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا

عبداللہ بن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضوان اللہ علیہما کی قبر پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان دونوں شعر کو پڑھا، ملاحظہ ہو ترمذی ۱/۱۲۵، ایضاً المشکوٰۃ ص ۱۳۱، متمم نے یہ اشعار اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے قتل پر مرثیہ میں کہے تھے، تفسیر میں "لن یتصدعا" کی جگہ "لن نتصدعا" ہے،

دار المصنفین کی نئی کتاب

بزم تیموریہ

یعنی ہندوستان کے تیموری بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی علم دوستی، علما نواز اور ان کے درباری شعراء و فضلاء اور دوسرے ارباب کمال کا تذکرہ اور خصوصیت کے ساتھ آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر کے دیوان اور ان کے اردو کلام پر سیر حاصل تبصرہ،

ضخامت ۴۶۴ صفحے   قیمت :- للعہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین،

"مینجر"

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ

(۳)

غزل گو شعراء میں عام طور پر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، چنانچہ جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں، تو ان کی حالت اس درماندہ مسافر کی سی ہوتی ہے، جو دو چار قدم بہ کوشش تمام چلنے کے بعد طبعی ضعف کی وجہ سے دفعۃً لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے، لیکن علامہ مرحوم کا قلم کسی صنف سخن کے میدان میں عاجز و درماندہ نظر نہیں آتا، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، مراثی، قطعات، وغیرہ سب کے نمونے اس کلیات میں موجود ہیں، لیکن ہر جگہ شاعر کے انداز بیان کی استادانہ پختگی اور غیر معمولی قوت نظم کا یکساں عالم نظر آتا ہے،

علامہ مرحوم طبعاً نہایت غیور اور خود دار تھے، ان کو ہر حال میں اپنی عالمانہ شان و عظمت کے تحفظ کا خیال رہتا تھا، اس لیے ان کا قلم کبھی ارباب دول کی بیجا اور خوشامدانہ مدح سرائی سے آلودہ نہیں ہوا، اور یہ ان کے مذاق شاعرانہ کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت بڑا ثبوت ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ نے قصائد میں زیادہ تر واقعہ نگاری اور مناظر قدرت کی مصوری سے کام لیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

فصل بہار شعراء کا عام موضوع سخن ہے، جو مدت ہائے دراز سے پامال ہوتا چلا آرہا ہے، علامہ نے بھی اس موضوع پر ایک قصیدہ لکھا ہے، جو کسی وجہ سے ناتمام رہ گیا، تاہم جو چند اشعار بھی خامہ قلم سے نکل گئے ہیں ان کی رنگینی کا عالم ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں :-

دوش این مژدہ بگوش گل و ریحان آمد
کہ بہار آمد و بسیار بسامان آمد

ابر گوہر ہمہ افشاند چون گریان بگذشت
گل ہمہ زر بپراگند چون خندان آمد

آب را سلسلہ بر پائے بہ بستند ز موج
بسکہ دیوانہ وش از طرف بیابان آمد

لالہ چون مغبچگان ہیمہ برافروختہ باغ
سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوبان آمد

سبزہ سر برزدہ از خواب گرفت بجا آب
بسکہ باد سحرش مروحہ جنبان آمد

ہر حبابے کہ سر از آب برآرد، گوید
باید از سر بتماشاے گلستان آمد

می دمد گر بچمن گاہ خرامد لب جوئے
باد صبح آمد و بر شیوۂ مستان آمد

بوے گل ہست کہ بردوش صبا تکیہ زدہ ست
من غلط کردم و گفتم کہ سلیمان آمد

آتش افروخت گل و مرغ چمن گشت خلیل
کہ بہ آتش سوزندہ گلستان آمد

زین دو سہ حرف فزون نیست مغان را سخن
کہ بہار آمد و ابر آمد و باران آمد

غور کیجیے، عالم بہار کے جتنے خاص پُرکیف پہلو تھے، ان سب پر شاعر کی نگاہ کس خوبی کے ساتھ پڑی ہے اور تشبیہات کی لطافت نے انداز بیان کو کس قدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے،

علامہ مرحوم تبدیل آب و ہوا کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے لیکن کچھ دنوں کے قیام کے بعد بیمار پڑ گئے، اور وطن واپس چلے آئے، صحت یاب ہونے کے بعد علامہ نے ایک قصیدہ موسوم بہ قصیدۂ کشمیریہ لکھا جس میں علالت، علاج، تیمارداری اور صحت کے تمام حالات نہایت تفصیل کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیے ہیں، لیکن ابتدا میں کشمیر کے جلوہ گاہ حسن و جمال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف علامہ ہی کے خامۂ رنگین نگار کا کام ہو سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گرچہ شک نیست کہ آن نامیہ دیدہ بنائی
گر تنزل بکنم خلد برین را مانا ست

بسکہ جوشیدہ ز ہر سو گل و لالہ بہ دشت
از کران تا بکران روے زمین ناپیدا ست

جادۂ را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز
بسکہ گل صف زدہ سرتابسر او ز چپ و راست

جام گلرنگ کہ در بزم بآئین چینند
ہم بدان گونہ گل از پہلوے گل جلوہ نماست

سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سر تا بن
یا قبا ہست کہ بر قامت شخص آید راست

راہرو راند بہ دل کہ نہد گام براہ
بسکہ بر ہر قدمش لالہ و گل در تہ پاست

دیدۂ طفل کہ بر دامن مادر غلطد
جنبش باد بدان گونہ بروے صحراست

کیا اس سے زیادہ لطیف اور نادر کوئی اور تشبیہ ذہن میں آسکتی ہے؟

گل بہر شاخ ز برگ است فزون تر گوئی
ہمہ بر گل بفزودند آنچہ کہ از برگ بکاست

سرو اگر پائے بدامن نکشد، خود چہ کند
زانکہ از جوش گل و لالہ چمن تنگ فضاست

بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے بنہند
در شب تار کسے گم نشود از رہ راست

کشمیر میں ایک مشہور جھیل ہے، جس کا نام ڈل ہے، اس کی صفائی اور لطافت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

آنگہرے کہ بشہر ست و بود نامش ڈل
گوئیا آئینہ در دست عروس زیباست

سینۂ صاف دلان ست ہمانا کز لطف
ہر چہ در بن بود از صفحہ رویش پیداست

گرد بر گرد ڈل آن صف زدن لالہ و گل
چون طرازیست کہ بر دامن شفق رخاست

کشمیر میں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے، جس کو سطح آب پر پھیلا کر خاکپوش کر دیتے ہیں، اور اس پر مختلف چیزوں کی کاشت کرتے ہیں، اس حیرت انگیز قوت نامیہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے:

آب بالاے زمین باشد و اینجا بینی
کہ زمین بر سر آب ست و ہمان پا بر جا ست

آخر میں سلسلۂ سخن کی طوالت کا جو عذر شاعر نے پیش کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہے، ملاحظہ ہو،

گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید   چہ توان کرد سخن ہم ز سر نشو و نما ست

اس کے بعد علامہ نے اپنی علالت و علاج وغیرہ کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں، یعنی کس طرح ان کو بخار آیا، اس بخار کی نوعیت کیا تھی، اس کی شدت اور تکلیف کا کیا عالم تھا، مقامی احباب نے کس طرح خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا، طبیب نے نبض وغیرہ دیکھکر اور تمام اسباب و علل پر غور کر کے مرض کی کیا تشخیص کی، علاج سے کیا فائدہ ہوا، فائدہ ہو کر پھر دوبارہ مرض نے کس شدت کے ساتھ عود کیا، غایت ضعف کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہو کر اپنی املاک و دولت کے متعلق بطور وصیت کیا ہدایتیں کین، وطن کس حالت مین واپس آئے، یہان کس قسم کا علاج ہوا، اور کبتک ہوتا رہا، صحت کیونکر ہوئی، ان تمام جزئی واقعات کو علامہ نے جس خوبی سے نظم کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلم کو واقعہ نگاری پر کس قدر قدرت حاصل تھی، آخر مین اپنے احباب خاص کو مژدۂ صحت دینے کے بعد اپنے متعلق فرماتے ہین اور کس قدر صحیح فرماتے ہین،

شبلی امروز بود بلبل بستان سخن   کہ از و گلکدۂ ہند پر از صوت و نوا ست

علامہ کے کمال واقعہ نگاری کی ایک دوسری مثال وہ قصیدہ ہے جو انھون نے اپنے سفر روم کے حالات مین لکھا ہے، یہ قصیدہ دراصل ایک منظوم سفر نامہ ہے، جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ سفر کا اصلی مقصد کیا تھا، کس تاریخ کو اس کا آغاز ہوا، جہاز پر کیا کیفیت رہی، کن کن مقامات سے گذر ہوا، ان مقامات کی کیا حالت تھی، کہان کہان جہاز نے قیام کیا، اور کب منزل مقصود پر پہنچا، افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم اس پورے قصیدے کو نقل نہین کر سکتے، چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہون،

بہر تکمیل فن و بہر پے تحصیل ہنر   روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر

فارغ از عیش و زیارت چو مرا کرد خدا   خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

گرچہ من گرم طلب بودم و بس مستعجل   لیک تاخیر ہمی رفت بفرمان قدر

دیر آن مایہ شد آخر کہ حسودان گفتند   کہ فلان جز ہوس خام ندارد در سر

من درین غصہ و غم خون جگر می خوردم   ناگہان شاہد مقصود در آمد از در

اتفاقے عجبے گشت مرا عقدہ کشا   کہ از و وہم و گمان نیز نمیداشت خبر

یکدو مہ پیشتر ک زانکہ زنم کوس رحیل   بودم از زحمت تپ خستہ دل و تفتہ جگر

عزم دیرینہ بیاد آمد و گفتم چہ خوش است   کہ بیک حیلہ دو تا کار بر آرد داور

آغاز سفر مین جہاز پر دو تین روز جو کیفیت رہتی ہے، اس کا اظہار ان الفاظ مین کیا ہے،

الغرض از رمضان بست و ششم بود کہ من   گرم برخاستم از جاے و شدم راہ سپر

او فتادم بر ہ کوہ و بیابان یکچند   بس بکشتی بنشستم من و یاران دگر

زحمتے صعب کشیدیم بکشتی دو سہ روز   بسکہ از موج ہر لحظہ شدے زیر و زبر

کس نیارست سرش باز گرفت از بالین   کس نیارست جدا کرد تنش از بستر

اس کے بعد جہاز جن مختلف مقامات سے گذرا، ان کی تفصیل بیان کی ہے اور ہر مقام کی حالت بھی مختصر بیان کردی ہے، مثلاً عدن کے متعلق لکھتے ہین،

کوہسار یست کہ ہر چند بلند ست و فراخ   لیک از سبزہ و گل نیست درو ہیچ اثر

ہر کجا می گذری ریگ روانست و خزف   ہر طرف می نگری خاک سیاہ ست و حجر

گبر و ترسا کہ نزیل اند درین بقعہ ہمہ   بزبان عربی حرف زنندے یکسر

سویز مین اگرچہ جہاز نے بہت کم قیام کیا، تاہم اس کا تذکرہ قلم انداز نہین کیا ہے، فرماتے ہین،

این ہمان نہر عجیبست کہ زینسان کارے   جز در افسانۂ پارین نشنیدیم دگر

بست فرسنگ دراز ست و بپہنا چندان   کہ دو دو البور توانند از و کرد گذر

بروت پہنچ کر جو دلکش سمان نظر آیا ہے، اس کی تصویر ان الفاظ مین پیش کی ہے:

خوب جا سے ست کہ نا خواستہ در باز و دل ہر کہ سوزے بدلش دارد و درد سے بجگر

موضعے نرم و سیرے خوش و جائے دلکش راہ ہموار و زمین پاک و مکان خوش منظر

گبر و مسلم ہمہ خوش جامہ و موزون اندام خاص و عامی ہمہ گلگون تن و زیبا پیکر

چون برون رفتم ازینجائے وازان جا زنبود پیش می رفتم و بازم بقفا بود نظر

غرض اسی طرح تمام مقامات راہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بخیر و خوبی منزل مقصود پر پہنچے ہین لیکن سلسلۂ بیان مین کوئی انتشار یا پراگندگی پیدا ہونے نہین پائی ہے، بلکہ شروع سے آخر تک روانی اور تسلسل کا یکسان عالم نظر آتا ہے۔

واقعہ نگاری کا اصلی کمال یہی ہے کہ جو واقعہ یا منظر پیش کیا جائے اس کی مکمل تصویر آنکھون کے سامنے آجائے، یعنی کوئی خاص پہلو یا رخ نظر انداز ہونے نہ پائے، ورنہ تصویر ناقص اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی، اس موقع پر انداز بیان کی موزونی کا بھی لحاظ ضروری ہے، یعنی جس قسم کا واقعہ یا منظر ہو اسی مناسبت سے پیرایۂ بیان اور الفاظ کا بھی انتخاب ہونا چاہیے، ورنہ پوری نظم نغمۂ بے آہنگ ہو کر رہ جائے گی، لیکن ان مقاصد مین حصول کامیابی کا انحصار شاعر کی قوت مشاہدہ، قدرت زبان اور بلاغت شناسی پر ہے، قوت مشاہدہ اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کا کوئی موثر پہلو چھوٹنے نہ پائے، قدرت زبان اس لیے درکار ہے کہ انداز بیان غیر مربوط اور پراگندہ نہ ہونے پائے، بلاغت شناسی کی اس لیے ضرورت ہے کہ جو الفاظ استعمال کئے جائین، وہ واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے موزون اور مناسب ہون۔

علامہ کے قصائد مین یہ تمام خصوصیتین کافی طور پر موجود ہین، مثلاً قصیدہ کشمیریہ کو دیکھو جس کا تعلق کشمیر کے دلفریب قدرتی مناظر کا تعلق ہے، غور کرو، انداز بیان کس قدر شاعرانہ کیف و رنگینی مین ڈوبا

ہوا ہے، لیکن جہان سے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے، یہ رنگینی دفعتہ سادگی سے بدل جاتی ہے کہ اب شوخی و رعنائی کا موقع نہین،

اس سلسلہ مین علامہ کا قصیدہ عیدیہ خاص لحاظ کے قابل ہے، جس مین انھون نے عید کے عیش و طرب کی ہنگامہ آرائیون کا منظر دکھلایا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون، جن سے اندازہ ہوگا کہ بحیثیت واقعہ نگار کے علامہ کی نگاہ کس قدر باریک بین واقع ہوئی تھی، فرماتے ہین:

روز عید ست و دگر گار جہان گشت بساز باز شد بر رخ گیتی در امید فراز

سخن از مے چہ کنی بادہ چہ خواہی امروز نشۂ عیش ندارد بمے و بادہ نیاز

مردمان بسکہ زہر گوشہ فراز آمدہ اند نگہ از تنگی جا بار نمی یابد باز

آن یکے جلوہ فروش آمدہ در خانۂ زین وان دگر بر زدہ بر ہودج زربانش ناز

آن یک از تابش خور پردہ فروہشتہ بروے وان دگر در کف چتر شدہ جلوہ طراز

شملہ را کردہ چو ان سررشتۂ امید دراز واعظ آراستہ عمامہ واز روے شرف

زاہد سادہ ہم از کلبۂ تنہائی خویش با کہن خرقۂ خود رفت برون بہر نماز

با ہمہ شوکت و فر با ہمہ تمکین و شکوہ خلق در عیدگہ آمد زرہ صدق و نیاز

نفسے چند نشستند دو زانو وانگہ راست چون سرو ستادند پے ذکر نماز

مفتی شہر ہم از جا بامامت برخاست با ہمہ صدق و صفا با ہمہ اخلاص و نیاز

انچہ بایست ز ترتیل و سکون در قرأت ہمہ بر وجہ حسن کرد ادا آن ممتاز

پس دگر خطبہ بفرمود بآواز بلند خطبۂ چون سخن قامت محبوب دراز

شور برخاست ز مردم کہ مبارک بادا عید و این گرمی ہنگامۂ این زینت و ساز

کودک از روے ادب عرض نیایش میکرد پیر گفتے صد و سی سال ترا عمر دراز

واقعہ نگاری کے لحاظ سے ان اشعار پر غور کرو، عید کا پورا منظر آنکھون کے سامنے آجاتا ہے، کوئی معمولی شاعر لکھتا، تو غالباً صرف اتنا لکھکر رہ جاتا کہ عید گاہ مین مختلف قسم کے لوگون کا ہجوم ہوا، نماز ادا کی، امام نے خطبہ پڑھا، اور لوگ سلام و معانقہ کرکے اپنے گھرون کو واپس چلے گئے، لیکن شان و شوکت کے ساتھ عید گاہ مین ہر گوشہ سے لوگون کا جمع ہونا، کسی کا پیدل اور کسی کا فرین سواری پر آنا، کسی کا دھوپ سے بچنے کے لیے چہرے کو کپڑے سے چھپائے رکھنا، اور کسی کا چھتری لگائے رہنا، چند منٹ تک لوگون کا دوزانو ہو کر مسجد مین مودب بیٹھنا، اور پھر نماز کے لیے کھڑا ہونا، امام کا باقاعدہ قرأت کرنا، نماز ختم ہونے پر ایک طویل خطبہ پڑھنا، لوگون کا ایک دوسرے کو مبارکباد دینا، چھوٹون کا بڑون کو سلام عرض کرنا، اور بڑون کا بزرگانہ دعائین دینا، ان تمام جزئیات پر جن کے بغیر واقعہ کی تصویر نامکمل رہ جاتی، ایک دقیق النظر شاعر ہی کی نگاہ پڑ سکتی تھی،

اس موقع پر دفعۃً مسلمانون کے گذشتہ جاہ و جلال کا منظر علامہ کی نگاہون کے سامنے آجاتا ہے، اور ان کا درد آشنا دل تڑپنے لگتا ہے، کہ وہ قوم جس کے کوکبۂ سطوت و جبروت کے آگے بڑے بڑے کجکلاہون کی گردنین خم ہو گئی تھین، اور جس کی تیغ و قلم کے نادر المثال فتوحات کے ابدی نقوش ابتک تاریخ عالم کے صفحون پر چمک رہے ہین، آج وہ کس زوال و پستی کی حالت مین ہے، اور اس کا افق حیات کس قدر تاریک اور غبار آلود نظر آتا ہے! ارباب ذوق پر ظلم ہوگا اگر ہم انکو علامہ کے ان احساسات سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دین، انداز بیان کا جوش و خروش ملاحظہ ہو، فرماتے ہین:

خود ہمان جمع کہ میداشت ہم تیغ و قلم
خود ہمان قوم کہ بود ہست بہر پایہ فراز

آنکہ در انجمن فضل نمیداشت ہمال
آنکہ در جرگہ دہر نبودش انباز

آنکہ جان در تن افسردہ معنی بدمید
آنکہ برداشتہ قفل از در گنجینۂ راز

ہیئت و ہندسہ را پایہ ازو گشت بلند
منطق و فلسفہ را داد ہم او زیب و طراز

یاد آن رونق بازار ہنر در بغداد
یاد آن گرمی ہنگامۂ فن در شیراز

قرطبہ آنکہ ازو کسب ہنر کرد فرنگ
وان سلرنو کہ اطالیہ بدو داشت نیاز

خود ہمان جمع کہ افراخت بعیوق علم
آنکہ بر اوج فلک سود کلہ گوشۂ ناز

آنکہ پامال خرامش چہ خراسان چہ بہار
آنکہ تاراج نگاہش چہ عراق و چہ حجاز

آنکہ دیلم بجبین داغ سجودش بردا شست
آنکہ سلجوق بخاک در او کرد نماز

روم را لرزہ بر اندام ز بانگ غضبش
ہند را غلغلۂ مقدم او زہرہ گداز

فتح را از پئے طاعت خم تیغش محراب
بخت را بہر پرستش در او کعبۂ راز

رمح او بود کہ تاج از سر قیصر بربود
تیغ او بود کہ شد با دل کسری ہمراز

اینک آن قوم بحالیست کہ نتوان گفتن
خود ببین تا بچہ انجام رسید آن آغاز

نالہ ہمچو است بر آید ز دل خستۂ ما
شیشۂ را ہست بہنگام شکستن آواز

ہرچہ بر ماست ہم از دست سیہ کاری ماست
گلہ نیست ز بخت و فلک عربدہ ساز

غور کرو، ان چند اشعار مین شاعر نے کس خوبی اور جوش کے ساتھ مسلمانون کے عہد اقبال و کامرانی کا پورا سمان ہماری نگاہون کے سامنے کر دیا ہے! تاریخی واقعات کو انداز بیان کی شعریت قائم رکھتے ہوئے اس طرح پر جوش طریقہ پر نظم کرنا در اصل شاعری کا ایک بڑا کمال ہے، ان اشعار کی تاثیر کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ یہ خود شاعر کے قلب و روح کے تاثرات ہین۔

علامہ مرحوم کی طبیعت مین اجتہاد اور جدت کا غیر معمولی مادہ تھا، اس لیے ہر فن مین ان کا قدم عام شاہراہ سے ہمیشہ الگ پڑتا تھا، شاعری مین بھی قدیم روش جس کو واقعیت اور سادگی سے بہت کم تعلق تھا، ان کی جدت پسند طبیعت کو بہت زیادہ پسند نہ تھی، چنانچہ ایک قصیدے

مین قدیم انداز تغزل اور مدح سرائی پر پرزور الفاظ مین تعریض کی ہے، اور قدما، کی کورانہ تقلید کو ننگ ہمت قرار دیا ہے، فرماتے ہین:

جادۂ پیشروان رستم و دانم کہ خرد — اندرین شیوۂ ناممن بمدارا ماند
ننگ ہمت بود آئے کہ زبان تازہ کنی — ہم از ان جرعۂ باقی کہ بمینا ماند
نیست جز دونی فطرت کہ بیازار کمال — چشم دوزی بمتاعے کہ زلیخا ماند
صرفہ نبود کہ ہمان بر روش پیشروان — خامہ در راہ سخن بادیہ پیما ماند
داستان چند توان کرد ز مجنون و لیلیٰ — تا یکے خود سخن از وامق و عذرا ماند
گر نسیم از شکن زلف کشاید گرہے — فکر را با تو عہد آویزش بیجا ماند
شعلۂ رابستائی و بگوئی کہ بجاہ — کمترین بندۂ او با جم و دارا ماند
ہرزۂ چند ہم بافی و سنجی کہ بدہر — سخت خاتمۂ دفتر انشا ماند
شیوۂ مدح و غزل گرچہ دلآرا و خوشست — مبتذل گشت نہ چندان کہ گوارا ماند

اس مین شبہہ نہین کہ عام شعراء کی بدمذاقی کی وجہ سے غزل صرف مصنوعی اور عامیانہ جذبات کا تماشاگاہ بنکر رہ گئی، قصیدہ جو مختلف قسم کے واقعات و مناظر کی مصوری کا ایک نہایت نمایان آلہ تھا، اس کا خاص موضوع مدح قرار دیا گیا، جس مین بجز مبالغہ کے اصلیت کا شائبہ بہت کم ہوتا تھا، صنائع و بدائع، لفظی خراش تراش، دور از کار اور خارج از قیاس تشبیہات و استعارات وغیرہ یہ تمام چیزین جن کو نفس شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا، عام طور پر شاعری کے کمالات مین داخل ہوگئی تھین، تخیلات جس قدر پادر ہوا، اور جادۂ حقیقت سے دور ہون، اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھے جاتے تھے، ظاہر ہے، کہ ایسے فرسودہ، مصنوعی اور بے کیف انداز سخن کی تقلید پر علامہ کا نکتہ سنج اور جدت آفرین دماغ کب آمادہ ہوسکتا تھا، چنانچہ اس محدود دائرۂ شاعری کی تقلید کے

خلاف انھون نے پرجوش صدائے احتجاج بلند کی ہے، فرماتے ہین:

ہان وہان چند توان بود بتقلید اسیر — وائے آنکس کہ بیک سلسلہ برپا ماند
پائے ازین دائرۂ تنگ برون نہ کہ سخن — خود محیطیست کہ ہر قطرہ بدریا ماند
راستی ورزو چنان پیکر گفتار آرائے — کہ فروغ اثرہ از ناصیہ پیدا ماند

اس کے بعد بطور مثال کے صبح کے منظر کی تصویر اپنے دلکش انداز مین پیش کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون،

مشک شب جملہ بتاراج ردہ و زدم ہم — شوشۂ سیم پراگندہ بہر جا ماند
سحر از جیب افق سر بزند خندہ زنند — شب بخود پیچد و از غصہ لبو دا ماند
آید از صحن حرم نغمۂ معذن در گوش — دیر از نالۂ ناقوس پر آوا ماند
رند با شیشۂ مے راہ چمن گیرد و شیخ — در غم سبحہ و مسواک و مصلا ماند
چمن از غلغلۂ مرغ بجنبش افتد — کوہ از قہقہۂ کبک پر آوا ماند
پاسبانان ز سر کوچہ و درہ برخیزند — در میخانہ ز یورش ہمہ کس وا ماند
کاروانہا بہ رہ افتند و جرس نالہ کشد — دشت و صحرا پر از آوازۂ غوغا ماند
رند میخوارہ کہ از بادۂ دوشین سرمست — ہمچنان فارغ از اندیشۂ فردا ماند
گاہ سر برزند از خواب و رود باز بخواب — گاہ مخمور ز جا خیزد و از پا ماند
دست در گردن معشوق چو خیزد عاشق — ہم بدست دگرش گردن مینا ماند

ایسے وقت مین خود علامہ کس عالم مین ہین، وہ بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہین:

در چنین وقت بہ تنہائی آشفتہ گذر — کہ قلم در کف و آمادۂ انشا ماند

طوالت کا لحاظ ضرور ہے، تاہم ناظرین کو اس قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار سنائے

بغیر آگے بڑھنے کو جی نہین چاہتا، تغزل کی حیثیت سے بھی ان اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو،

دل پر حوصلہ آخر چہ زد عوی ماند   تا کہ آزرد کہ بدرد تو شکیبا ماند

رضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز   از زبان آنچہ دمِ عرض تمنا ماند

بر سر اپائے جمال تو نگاہم گوئی   رہروے ہست کہ از ضعف بجا ماند

ارمغانے نبود در خاکِ در او   مگر آن سجدہ کہ آمادہ بہ سیما ماند

نو بہار ان ہمہ نرگس بدماند کہ چمن   بر جمالت ہمہ تن محو تماشا ماند

مے بیا شام و لبِ لعل مرا نو بہ بوس   کین گنہ در روشِ عشق بہ تقوی ماند

اس شوخی اور شوریدہ مزاجی کی داد دینا آسان نہین ہے، اگر کسی مین اتنی جرأت بھی نہ ہو تو اسکو اس بادۂ مرد افگن کے دُرد جام کی تمنا کرنی چاہیے،

علاوہ قصائد کے علامہ نے اکثر مسلسل نظمین ترکیب بند کی شکل مین مختلف موقعون پر لکھی ہین جن مین انھون نے خاص طور پر اپنے قومی اور مذہبی درد کا اظہار کیا ہے، اور مسلمانون کو اسلاف کے گذشتہ کارنامون کی یاد دلا کر موجودہ خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان کی اصلی فلاح و ترقی کار از یورپ کی کورانہ تقلید مین نہین، بلکہ صرف کتاب و سنت کی پیروی مین پوشیدہ ہے، اس مین شبہ نہین کہ علمی حیثیت سے علامہ نے مفکرین مغرب کی طرز تحقیق و تنقید سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا تھا، وہ ان تنگ نظر قدیم علماء مین نہ تھے، جو یورپ کا نام لینا بھی کفر سمجھتے تھے، لیکن اس جلوہ گاہ مادیت کے ظاہری آب و رنگ کی تہ مین جو اخلاقی اور روحانی تیرگی و پستی کا منظر پوشیدہ تھا، وہ ہمیشہ ان کی حقیقت آشنا نگاہون کے سامنے رہا، ان کا مسلمانون سے یہ مطالبہ نہ تھا کہ وہ دنیا کو چھوڑ دین، اور قدرت نے ان کے نظام جسمانی کی راحت و آسایش کے لیے جو سامان پیدا کیا ہے، اس کو کام مین لانے کی کوشش نہ کرین، بلکہ ان کو ترک دین کی معصیت کا افسوس تھا، وہ دین اور دنیا دونون کو ساتھ لیکر چلنا چاہتے

تھے، کہ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی تھی، ان کو جدید تعلیم یافتہ گروہ سے یہ شکایت نہ تھی کہ اس نے مغرب کے علوم و فنون سیکھنے مین غیر معمولی شغف سے کام لیا ہے، بلکہ ان کو اس کا صدمہ تھا کہ یہ گروہ یورپ کی تقلید مین اس درجہ محو ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے بزرگون کی کوئی داستان یاد نہین رہی، اور ذہن سے یہ خیال بالکل جاتا رہا کہ اس فریب گاہ رنگ و بو سے ماورا ابھی ایک اور عالم ہے جس کا تعلق انسان کے قلب و روح سے ہے، یہی وہ عالم ہے جس کو برباد کر کے دنیا حقیقی عیش و سکون کی دولت سے محروم ہو گئی ہے، چنانچہ علامہ نے ایک ترکیب بند مین دنیاوی جاہ و حشم کے تماشائیون کو اس عالم روحانی کے سیر و تماشا کی خاص طور پر دعوت دی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون:

عالمے ہست کہ آنجا سخن از جان باشد   عالمے ہست کہ در دش ہمہ دہقان باشد

عالمے ہست کہ ہر ذرۂ او را بہ فروغ   پنجہ در پنجۂ خورشید درخشان باشد

عالمے ہست کہ آنجا بہ رہ و رسم نیاز   چرخ و انجم ہمہ سر بر خط فرمان باشد

خاک او معتکفِ دیلم و سلجوق بود   در گہش سجدہ گہِ قیصر و خاقان باشد

سخن آنجا رود از منبر و محراب و دعا   گر حدیثے ہمہ از گنبد و ایوان باشد

سامری دم نتواند زدن آنجا کہ خود آنجا   پنجہ بر تافتۂ موسیٰ عمران باشد

داستانہائے تو افسانۂ شاہست و وزیر   حرف آن بزم ز پیغمبر و یزدان باشد

تو حدیث از جم و دارا بسرائی و آنجا   گفتگو از عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ باشد

تو بہ فرمودۂ اسپنسر و بیکن نازی   سخن آنجا ہمہ از گفتۂ یزدان باشد

کم ز آئین جہانداری سولن نبود   آن اساسے کہ بر آوردۂ نعمان باشد

ہان نگوئیم کہ آن گیری و این بگذاری
حیف باشد کہ تو سر رشتۂ دین بگذاری

علامہ کو دنیاوی جاہ و حشم کے حصول پر اعتراض نہیں، ان کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے:

خوش بود اینکہ ترا جاہ و حشم ہم باشد — لیک حیف است اگر حرمت دین کم باشد

ملک و دین ہر دو بیا گشتہ اند ز پے ہم اند — اندران کوش کہ این باشد و آن ہم باشد

شرط اسلام نباشد کہ بہ دنیا طلبی — التفات تو بہ دین نبوی کم باشد

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی — یورپ ار گپ زند آن نیز مسلّم باشد

حل ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی — شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد

از ابوبکرؓ و عمرؓ ہیچ بہ یادت ناید — گرمیِ بزم تو از سیزر اعظم باشد

در سخن بگذرد از سیرت و شان نبوی — ہر چہ گوئی ہمہ از گفتۂ ولیم باشد

انچہ حق است ترا در نظر آید باطل — انچہ شہد است بہ کام تو بہ سم باشد

غور کیجئے، جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ذہنیت کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے!

علامہ تعلیم جدید کے مخالف نہ تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان شوق سے مغربی علوم و فنون سیکھیں، لیکن اسی کے ساتھ اپنے قومی اور مذہبی خصائص کو زندہ اور قائم رکھیں، چنانچہ ایک دوسرے ترکیب بند میں اس گروہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

ایکہ بر مائدۂ یورپ مہمان باشی — حیف باشد اگر از جملۂ ایشان باشی

حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیان — منکرِ فلسفۂ سنت و قرآن باشی

گفتۂ سولن و آئین جہانبانی او — بر زبان داری و بیگانہ ز نعمان باشی

از ہنیبال صد افسانہ و دستان گوئی — جاہل از معرکہ ہائے شہ مردان باشی

قیصران را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بیخبر از عمرؓ و حیدرؓ و عثمانؓ باشی

از خداوند جہان یاد نیاری گاہے — روز و شب خود بہ پرستاری سلطان باشی

در بیر سی کہ درین کار چہ تدبیر بود — دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

یہ کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، بلکہ تیرہ سو برس پہلے ایک طبیب روحانی نے یہ نسخہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، جس کا کبھی یہ اثر تھا کہ مسلمان جس میدان میں قدم رکھتے تھے، فتح و کامرانی ان کے ہمرکاب رہتی تھی لیکن یہی قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کو ٹھکرا دینے والے آج خود ذلت و نامرادی کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کے ہاتھ سے دین الٰہی کا رشتہ چھوٹ گیا ہے، اور وہ اس صدائے حق کو بھول گئے ہیں، جو افواج باطل کے لیے ہمیشہ پیام شکست بنکر بلند ہوا کرتی تھی،

اس موقع پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شاید یہ جاننے کا اشتیاق ہو کہ علامہ کو جس جماعت سے تعلق تھا، اس کی ظاہری شان و شوکت کا کیا عالم ہے، اور وہ جس درسگاہ کے مبلغ و علمبردار تھے، اس میں داخل ہوکر ان کو وہ کونسی متاع بے بہا نصیب ہو سکتی ہے، جو مغربی مدارس کی فلک بوس عمارتوں میں نہیں مل سکتی، سب سے پہلے اس جماعت کی دنیاوی حیثیت کا حال سننا چاہیئے، فرماتے ہیں:

ما نہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم — ما نہ آنیم کہ اورنگ سلیمان داریم

ما نہ آنیم کہ با حاجب و دربان باشیم — ما نہ آنیم کہ بام و در و ایوان داریم

ما نہ آنیم کہ با مسند و بالین ارزیم — ما نہ آنیم کہ سرداب و شبستان داریم

ما نہ آنیم کہ یک شیوۂ باآئین گیریم — ما نہ آنیم کہ یک کار بہ سامان داریم

خاکساران جہانیم و ز اسباب جہان — بوریائیست کہ در کلبۂ احزان داریم

اب اس کلبۂ احزان کے بوریا نشینوں کے پاس جو گرانمایہ دولت ہے، اور جس کے سامنے ان کی نگاہوں میں دنیاوی جاہ و جلال کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

عجز و افتادگی و طوع و رضا خواہی ہست — گر ز ما شیوۂ پیشینۂ ما خواہی ہست

افسر و تاج و کمر بند و کلہ جوئی نیست   جامۂ کہنہ و پارینہ ردا خواہی ہست
قصر و بام و حرم و گنبد اگر خواہی نیست   مسجد و منبر و محراب دعا خواہی ہست
آن مے کہ ز فرنگ ست ، نداریم بجام   بادۂ خمکدۂ صدق و صفا خواہی ہست
شرح افسانۂ روم نتوان جست ز ما   در دلاویز حدیث خلفا خواہی ہست
ما مداوائے تب و درد ندانیم ولے   گر ز رنجوری الحاد شفا خواہی ہست
گفتۂ بیکن و دیکارٹ نداریم بیاد   در حدیثے ز رسول دو سرا خواہی ہست

آج اسی متاع گران از سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ جمعیت اسلام کی وہ پستی و زبون حالی ہے جسکا نقشہ علامہ نے اسی ترکیب بند کے ایک بند مین پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون،

آنکہ در معرکہ تاج از سر قیصر بربود   دست و بازوش بیکبار ز کار افتادست
آنکہ چون مہر جہانتاب بعالم می تاخت   خاک رہ گشتہ و در راہ گذار افتادست
آنکہ صد قلعۂ روئین بیکے حملہ کشود   حالیا از ہمہ سو خود بحصار افتادست
دست و سر پنجۂ آن شیر ژیان رفت ز کار   تہمتن در تگ و پو آمدہ و خوار افتادست
آنکہ در پیکر صد مردہ ہمی جان بدمید   ہست بر بستر بیماری و زار افتادست
مرغ خوش زمزمہ را کار بصیاد افتاد   دامن شاہد گل در کف خار افتادست
می زیبی کہ نژاد عرب و آل لوئی   خوار و سر گشتہ بہر شہر و دیار افتادست
دست ہر سفلہ بناز نگریش گشتہ دراز   ہمچو بغداد کہ در دست تتار افتادست

مذکورۂ بالا مثالین واقعہ نگاری کی حیثیت سے بھی قابل لحاظ ہین، اب یہ نہین کہا جا سکتا کہ علامہ مرحوم کا دائرۂ سخن صرف غزل تک محدود تھا، اور انکے قلم مین واقعات، حالات اور قدرتی مناظر کی نقاشی کی قابلیت نہ تھی، بلکہ واقعہ اسکے بالکل برعکس نظر آتا ہے، ان مثالون پر غور کرو، قوت نظم مین کوئی سستی یا ترتیب خیال مین کوئی پراگندگی محسوس نہین ہوتی اور

انداز بیان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی ہمیشہ قائم رہتی ہے، ہمارے نزدیک ایک باکمال شاعر کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین پیدا کرتا ہے، لیکن وہ کبھی نہین بھولتا کہ وہ شاعر ہے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے، ہمیشہ شاعرانہ انداز و کہتا ہے، خواجہ حافظ کا خاص کمال یہی ہے کہ انھون نے فلسفہ، اخلاق، تصوف، سیاست وغیرہ ہر قسم کے مضامین ادا کیے ہین لیکن پھر بھی ان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی کا رشتہ کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہین پاتا، علامہ مرحوم کے انداز بیان کی بھی یہی خاص خصوصیت ہے کہ وہ معمولی باتین بھی اسطرح ادا کرتے ہین کہ ان مین ایک خاص مزہ محسوس ہونے لگتا ہے، مثال کے طور پر دیکھیے کہ یہ خیال کہ مسلمان اسقدر کمزور اور بیجان ہو گئے ہین، کہ جو چاہتا ہے انکو غارت کرنے کیلیے کھڑا ہو جاتا ہے، کتنا معمولی خیال تھا لیکن غور کرو، "ہمچو بغداد کہ در دست تتار افتادست" کی تاریخی تشبیہ نے اس خیال کو کسقدر پرلطف طریقہ پر ادا کر دیا ہے، یہ بات بھی کتنی معمولی تھی، کہ "مسلمان دشمنون کے دام ستم مین گرفتار ہین" لیکن اس کو کس انداز سے ادا کیا ہے،

مرغ خوش زمزمہ را کار بصیاد افتاد   دامن شاہد گل در کف خار افتادست

اسی کا نام شاعرانہ انداز بیان ہے، بات کیا تھی، اور کسطرح کہا ہے کہ بے اختیار ذوق صحیح وجد کرنے لگتا ہے، ان مثالون سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ علامہ کے مذاق سلیم نے عام طور پر قصائد اور ترکیب بند سے وہی کام لیا ہے، جو واقعی ان کا صحیح مصرف تھا، یعنی کہین مناظر قدرت کی مصوری کی ہے، کہین مختلف واقعات و حالات کا نقشہ پیش کیا ہے، کہین اسلام کے گذشتہ جاہ و جلال کی یاد تازہ کی ہے، کہین مسلمانون کی موجودہ روحانی اور اخلاقی پستی پر اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے، کہین قدیم اور جدید تعلیم کے نقائص بیان کیے ہین، کہین رہ نمایان مغرب کی ضلالت اور گمراہی کا راز طشت از بام کیا ہے، اور کہین اتباع کتاب و سنت کی وہ دیرینہ دعوت دی ہے جس کو قبول کیے ہوئے بغیر بد نصیب مسلمانون کے آلام و مصائب کا خاتمہ نہین ہو سکتا، غرض جو کچھ لکھا ہے، وہ واقعیت سے متجاوز نہین ہے، اور جس طرح لکھا ہے اس کو ایک وسیع النظر اور قادر الکلام شاعر ہی لکھ سکتا ہے،

(باقی)

مسلمان سلاطین کی تصانیف

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

مامون الرشید

مامون عباسی خلفا کا گل سر سبد تھا، اور اس کا عہد علمی حیثیت سے دورِ زرین تھا، اس کے زمانہ کی علمی ترقیون کی تفصیل کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہے، اور یہ حالات بڑی حد تک احمد فرید رفاعی کی عصر المامون اور علامہ شبلی کی المامون مین موجود ہین جن کے اعادہ کی ضرورت نہین ہے، اس لیے ہم صرف اسکے ذاتی علم و فضل کا مجمل خاکہ پیش کرنے کے بعد اس کی قلمی یادگارون کا تذکرہ کرین گے.

۱۷۰ھ مین مامون کی ولادت ہوئی، ۱۸۳ھ مین ولیعہد اور امین کے قتل کے بعد ۱۹۸ھ مین مستقل خلیفہ ہوا، ۴۸ برس کی عمر مین ۲۱۸ھ مین وفات پائی،

ہارون خود صاحبِ علم اور اہل علم کا قدردان تھا، اس کے دربار مین شعرا، ادبا، فقہا اور محدثین کا مجمع رہتا تھا، اسی گہوارۂ علم مین مامون کی نشو و نما ہوئی، اور اسی مین اس نے تعلیم و تربیت پائی، کسائی جیسا نحوی، اصمعی اور عباس بن احنف جیسے ادبا، اور امام مالک جیسے امام حدیث اس کے اساتذہ مین تھے، یحیی برمکی جیسا فاضل روزگار اس کی تعلیم کا نگران تھا، اور ابو نواس، ابو العتاہیہ فراء، سیبویہ اس کے ہم جلیس اور ہم نشین تھے،

مامون بچپن ہی سے نہایت ذکی، ذہین اور طباع تھا، ان فضلاء کی صحبت نے اس کی فطری صلاحیتون کو اور چمکا دیا، اور تھوڑے ہی دنون مین وہ خود اہلِ علم کی صفِ اول مین آگیا،

وہ شروع ہی سے علم و فن، شعر و ادب پر ناقدانہ نگاہ رکھتا تھا، ایک دن اصمعی سے اس نے پوچھا یہ شعر کس کا ہے،

ماكنت الا كلحم ميت	دعا الى اكله اضطرار

اصمعی نے کہا ابن عیینۃ المہلبی کا، مامون نے کہا نہایت بلند خیال ہے، مگر فلان شعر سے ماخوذ ہے، اصمعی اس کی وسعتِ نظر پر سخت متعجب ہوا،[1]

ایک مرتبہ ہارون نے فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا، لیکن کئی روز گذر گئے، اور اس نے اپنے ارادہ کا اظہار نہین کیا، فوج پریشان تھی، مامون کو معلوم ہوا، تو اس نے فوج کی طرف سے فوراً یہ قطعہ لکھکر ہارون کی خدمت مین پیش کیا،

یاخیر من دبت المطی به	ومن تعدی لسرج الفرس

اے ان سب لوگون سے بہتر جن کو سواریان لے کر چلتی ہین، اور ایسے سوارون سے بہتر جن کے گھوڑون کی زین اپنی جگہ پر رہتی ہے، (یعنی سبک رفتار ہین)

من غایه فی المسیر نعرفها	ام امرنا فی المسیر ملتبس

سفر کا کوئی وقت ہے، جسے ہم لوگ جان سکین، یا یہ امر ہمارے لیے مبہم ہی رہے گا،

ما علم هذا الا الی ملك	من نوره فی الظلم یقتبس

اس بات کا علم صرف اس بادشاہ کو ہے جس کے نور سے ہم لوگ تاریکی مین روشنی حاصل کرتے ہین،

---

[1] مرآۃ الجنان یافعی تذکرہ اصمعی،

ہارون رشید یہ قطعہ پڑھ کر خوش تو بہت ہوا، لیکن شعر و شاعری سے اس کو منع کر دیا،[1]

ایک بار اُس نے محمد بن زیاد اعرابی سے جو مشہور نسّاب تھا، پوچھا کہ ہند کے اس مصرعہ

ین نحن بنات طارق (ہم طارق کی بیٹیاں ہیں) طارق سے کون مراد ہے، ابن زیاد نے بہت

خیال دوڑایا، لیکن ہند کے خاندان میں طارق کسی کا نام نہیں تھا، آخر میں مامون نے کہا کہ یہاں

طارق کے معنی ستارے کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے والسّماء والطّارق، شاعرہ نے فخریہ

اپنے کو ستارے کی طرف منسوب کیا ہے، ابن زیاد نے کہا کوئی سند ہونی چاہئے، مامون نے کہا

میں خود مجتہد الفن اور مجتہد الفن ہارون الرشید کا لڑکا ہوں:[2]

شعر و ادب کے علاوہ فقہ و حدیث پر بھی اس کی نظر وسیع تھی، اور وہ مسائل میں اہلِ فن

کی طرح نکتہ آفرینیاں کرتا تھا،

ایک دن علماء کا مجمع تھا جس میں ہر فن کے اہلِ کمال موجود تھے، ایک عورت مامون

کے پاس فریاد لے کر آئی کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر قضا کر گیا، لیکن لوگوں نے مجھے

صرف ایک اشرفی دلوائی ہے، مامون نے تھوڑا سا تامل کر کے عورت سے کہا تجھکو اتنا ہی

ملنا چاہئے، اس غیر متوقع جواب پر سب کو حیرت ہوئی، علما نے پوچھا یہ کیونکر؟ مامون نے

کہا کہ متوفی کے دو بیٹیاں ہوں گی، دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں تو ان کو ملیں، ماں بھی ہوگی

جس کو سدس یعنی سو اشرفیاں، زوجہ کو ثمن یعنی پچھتر اشرفیاں ملی ہوں گی، اب ۲۵ باقی رہیں، مامون

نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا سچ کہنا تیرے بارہ بھائی ہیں؟ عورت نے تسلیم کیا تو مامون نے

کہا دو دو ان کو ملیں ایک باقی رہی وہ تیرا حق ہے،[3]

ایک بار ایک شخص مامون کے دربار میں آیا، اور کہا میں محدث ہوں، اور اسی فن میں

[1] المامون ص ۱۹ [2] تاریخ الخلفاء سیوطی [3] ایضاً

ساری زندگی گذاری ہے، مامون نے کہا کہو فلاں مسئلہ کے متعلق کتنی حدیثیں یاد ہیں، وہ ایک

بھی نہ بتا سکا تو مامون نے اس کے متعلق بیسیوں روایتیں سنادیں اور سند کا ایک تار باندھ دیا، پھر اس شخص سے

ایک دوسرا مسئلہ پوچھا وہ اس کا بھی کوئی جواب نہ دے سکا تو مامون نے اس مسئلہ کے متعلق

بھی متعدد حدیثیں بیان کیں، پھر درباریوں سے مخاطب ہو کر فرمایا، کہ لوگ تین دن حدیث پڑھتے

ہیں، اور پھول جاتے ہیں کہ ہم بھی محدث ہیں،[1]

شعر و شاعری ہارون نے شعر و شاعری سے روک دیا تھا، شاید اسی لئے اس نے شعر گوئی

سے بہت کم دلچسپی رکھی تھی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی جب طبیعت کی روانی مجبور کرتی تو وہ دو چار شعر کہہ

لیا کرتا تھا، تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں اس کے بہت سے اشعار مذکور ہیں، نمونۃً دو چار نقل کئے جاتے ہیں

لسانی کتوم لا سرارکم   ودمعی نموم لسری مذیع

فلولا دموعی کتمت الھوی   ولولا الھوی لم یکن لی دموع

بعثتک مرتاداً ففزت بنظرۃ   واغفلتنی حتی اسات بک الظنا

فناجیت من اھوی وکنت مباعداً   فیا لیت شعری عن دنوّک ما اغنی

فیا لیتنی کنت الرسول وکنتنی   فکنت الذی یقصی وکنت الذی ادنی

اری اثر امنہ بعینک بیّنا   لقد اخذت عیناک من عینہ حسنا

علامہ شبلی نے ان اشعار کو المامون میں نقل کر کے لکھا ہے،

"قاصد پر رشک کرنا شعر کا ایک وسیع مضمون ہے اور بہت سے نازک خیالوں نے

اس کے مختلف پہلو نکالے ہیں مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مامون نے اس مضمون کو کس طرح

پلٹا ہے، اور ہر بندش میں جدت کے ساتھ بات میں بات نکالی ہے" (ص ۱۲۰)

[1] تاریخ الخلفاء،

نثر | مامون کے خطوط اور اس کے خطبات اس عہد کی عربی نثر کے بہترین نمونے ہیں، جن سے اس کی فصاحت و بلاغت اور ادب و لغت مین اس کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، ابن عبد ربہ نے العقد الفرید مین اس کے خطبات اور اہل تاریخ نے اس کے بہت سے خطوط نقل کئے ہین مگر ان کا نقل کرنا بقول علامہ شبلی کے اس لئے بے سود ہے کہ

"ناظرین مین کتنے عربی دان ہین، اور اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے، تو وہ بات باقی نہین رہتی"

ان علوم کے علاوہ مامون ایام عرب، فلسفہ، علم کلام اور علم ریاضی سے بھی خاصی دلچسپی رکھتا تھا[1]

تصانیف | ابن ندیم نے مامون کے مولفات مین تین کتابون کا تذکرہ کیا ہے،

(۱) کتاب جواب ملک البرغر، ملک برغر نے مامون سے اسلام اور توحید کے بارے مین کچھ سوالات کئے تھے، اس نے اس کتاب مین تفصیل سے ان سوالات کے جوابات دیئے ہین،

(۲) مناقب الخلفاء، یہ اس کی دوسری تصنیف ہے، اس مین اس نے خلفاء کے مناقب اور فضائل کا تذکرہ کیا ہے،

(۳) اعلام النبوۃ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور خرق عادت چیزون کا ذکر ہے،

ان کتابون کے کہین موجود ہونے کا کوئی علم نہین ہے،

عبد اللہ بن معتز عباسی

مامون (متوفی ۲۱۸ھ) سے مقتدر (متوفی ۳۲۵ھ) تک ایک صدی کے اندر ۹-۱۰ خلفاء ہوئے، مگر ان مین واثق، مستعین اور معتز کے علاوہ سب علم و فضل کے اعتبار سے معمولی حیثیت رکھتے تھے، واثق، مستعین اور معتز البتہ صاحب علم تھے، اور انھین علم و فن اور شعر و ادب سے خاصی دلچسپی تھی لیکن انھون نے کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی،

[1] المامون،

خاندان خلافت مین مامون کے بعد عبد اللہ بن معتز دوسرا شخص ہے، جو صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ صاحب تصنیف بھی تھا،

مورخین نے عبد اللہ بن معتز کو سلاطین اسلام کی فہرست مین داخل نہین کیا ہے، گو اس کی خلافت کی مدت چند دنون سے زیادہ نہین ہے، لیکن بہرحال اس کی بیعت ہوئی، اور چند دنون تک وہ تخت خلافت پر بھی رہا،

ولادت اور نام و نسب | اس کا نام عبد اللہ اور ابو العباس کنیت تھی، مشہور خلیفہ معتز کا لڑکا تھا، ۲۴۶ھ یا ۲۴۷ھ مین پیدا ہوا،

بیعت خلافت اور معزولی | مکتفی کی نامزدگی کے مطابق ۲۹۵ھ مین اس کے چھوٹے بھائی مقتدر کی بیعت ہوئی، یہ بہت کم سن تھا، اس لئے خاندان کے دوسرے تجربہ کار اور معمر افراد اور اکثر ارکان دولت نے مخالفت کی، لیکن وزیر دولت عباس بن حسن نے اپنی خود غرضی کی بنا پر اُن کے علی الرغم مقتدر کی بیعت کی رسم ادا کر دی،

بیعت کے بعد بھی عباسی خاندان کے تجربہ کار افراد اور ارکان دولت اس کی مخالفت کرتے رہے اور آخر کار انھون نے مقتدر کو معزول کر کے عبد اللہ بن معتز سے اس منصب کے قبول کرنے کی درخواست کی، اس نے کہا اگر بغیر کشت و خون کے لوگ مجھے خلیفہ مان لین تو مجھے اس کے قبول کرنے مین کوئی عذر نہ ہوگا، امراء نے جب یقین دلایا کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرے گا، تو وہ راضی ہو گیا،

۲۹۶ھ مین مقتدر کے خواص کے علاوہ تمام ارکان دولت نے عبد اللہ بن معتز کی بیعت کی، اور منصف باللہ، غالب باللہ، راضی باللہ یا مرتضی باللہ لقب دیا[1]،

عبد اللہ کی ... خلافت کو ابھی چند دن بھی نہین گذرے تھے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے

[1] ابن خلکان، میں یہ تمام القاب مذکور ہین، ج ۱، ص ۲۵۸،

ایسا انقلاب ہوا کہ لاچار وہ تختِ خلافت چھوڑ کر روپوش ہوگیا، اور دو ایک روز کے بعد گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا،[1]

علم و ادب معتز صاحبِ علم، خطیب، اور شعر و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتا تھا، اس لئے عبد اللہ کو یہ دولت گویا ورثہ میں ملی تھی، پھر اس کو مبرد اور ثعلب جیسے نحوی اور ادیب سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، اس لئے تھوڑے ہی روز میں خود اس کا شمار شعراء و ادباء کے زمرہ میں ہونے لگا،[2]

ابن ندیم اس کے علم و فضل کے متعلق لکھتا ہے،

واحد دهره فی الادب والشعر	شعر و ادب میں وحید عصر تھا،
وکان یقصد فصحاء الاعراب	بدوی فصحاء اور علمائے نحو کے
ویاخذ عنهم ولقی العلماء من	پاس جا کر ان سے (نحو و ادب
النحویین (ص ۱۶۸)	میں) استفادہ کرتا تھا،

ابن خلکان کا بیان ہے،

کان ادیباً بلیغاً، شاعراً	وہ ادیب، بلیغ، اور فطری شاعر
مطبوعاً مقتدراً علی الشعر	تھا شعر کہنے پر اسے پوری قدرت
قریب الماخذ سهل اللفظ	حاصل تھی، اپنے اشعار میں مانوس
جید القریحة حسن الابداع	اور سہل الفاظ استعمال کرتا تھا، طبیعت
للمعانی،	نہایت تیز پائی تھی نئے نئے مضامین
(جلد ا ص ۲۵۰)	پیدا کرنے میں اسے کمال حاصل تھا،

شعر و شاعری شعر و شاعری سے اُسے فطری مناسبت تھی، وہ خود شاعر تھا، اور دوسرے

---

[1] ابن خلکان ج ا ص ۲۵۰ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۰۸

شعراء کے صدہا اشعار اسے یاد تھے، ابن ندیم نے لکھا ہے، کہ مرزبانی (متوفی ۳۸۴ھ) نے مشہور شعراء کا ایک تذکرہ لکھا تھا جس میں ابن معتز کو فحول شعراء میں شمار کیا تھا، صاحب آغانی نے اس کی شاعری کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے؛

وشعره وان کان فیه رقة	اس کے اشعار میں اگرچہ شاہانہ نزاکت
الملوکیة وغزل الظرفاء	اور رندانہ تغزل، اور نئے شعراء کی
وهلهلة المحدثین فان	لطافت موجود تھی، لیکن ان اوصاف
فیه اشیاء کثیرة تجری فی	کے باوجود اس کے اشعار میں کثرت
اسلوب المجیدین وتقصر	سے ایسے اوصاف بھی تھے، جو اعلیٰ درجہ
عن مدی السابقین،	کے شعراء کا اسلوب ہے، اور جس میں
(آغانی ج ۹ ص [illegible])	سابقین شعراء بھی پیچھے رہ گئے ہیں،

عبد الرحمٰن الانباری (متوفی ۵۷۷ھ) نے طبقات الادباء میں اس کی شاعری کے متعلق لکھا ہے :-

ومحاسن شعره کثیرة (ص ۲۹۹)	اس کے محاسن شعری بہت ہیں،

اس کے اشعار کے جو نمونے موجود ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کو شاعری پر بڑی قدرت تھی، اور وہ ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا، اس کے اشعار کی اصلی خصوصیت جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے، روزمرہ اور آسان الفاظ کا استعمال اور معنوی جدت طرازی ہے چند اشعر یہ ہیں :-

قد اغتدی والليل يبكي تحته	في غرة الفجر والعصفور لم يطر

بسا اوقات اس نے مجھے صبوحی کے لئے علی الصباح اٹھایا، جب کہ گوریا ابھی آشیانے میں تھی

وجاءنی فی قمیص اللیل مستترا یستعجل الخطوء من خوف ومن حذر

وہ میرے پاس رات کے پیراہن میں چھپ کر آیا، اور رقیبوں کے خوف سے قدم جلدی جلدی ڈال رہا تھا

فقمت افرش خدی فی الطریق له ذلّا واسحب اذیالی علی الاثر

تیسرے شعر میں بڑی جدت طرازی ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب محبوب میرے پاس آیا تو میں نے اس کے راستہ میں اپنے کو بچھا دیا، تاکہ زمین پر اس کے پیر کا نشان نہ پڑے اور جو نشان زمین پر پڑ جاتے تھے، میں اُن کو اپنے دامن سے مٹاتا جاتا تھا، اس لئے کہ اگر پیر کے نشان باقی رہ جائیں گے تو افشاے راز کا خطرہ ہے،

وکان ما کان لست اذکره فظن خیراً ولا تسأل عن الخبر

اس رات جو کچھ ہوا ہوا، میں اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا، بس حسن ظن رکھو اور اس کے متعلق کچھ دریافت نہ کرو!

وکان وما کان اور فظن خیراً نے شعر میں بڑی خوبی پیدا کر دی ہے،

طوالت کے خیال سے ہم انہی چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں،

وہ شعراء پر تنقید بھی کیا کرتا تھا، ابوالعتاہیہ کے متعلق اس کی رائے تھی کہ اس کے اشعار تمام تر زاہدانہ ہوتے ہیں، لیکن وہ خود ملحد تھا، محمد بن حازم کے متعلق کہتا تھا کہ اس کے اشعار قناعت و توکل کے مضامین سے پر ہیں، مگر وہ خود کہنے سے بھی زیادہ حریص تھا، (ابن خلکان جلد ا ص ۲۵۹)

موسیقی | عباسی دور میں اس فن کو جو عروج حاصل ہوا، اس کا اندازہ اغانی کی ضخیم جلدوں سے ہو سکتا ہے، اکثر عباسی خلفاء اس سے ذوق رکھتے تھے، اور بعض کو فنی کمال کا درجہ حاصل تھا، صاحب اغانی اور صاحب نہایۃ الارب نے ایک خاص باب میں ان خلفاء کا ذکر کیا ہے، عبداللہ بن معتز کو بھی اس فن سے خاص دلچسپی تھی، اغانی میں ہے،

وکان عبد اللّٰہ حسن العلم بصناعة الموسیقی والکلام علی النغم وعللها (ج ۹ ص ۱۴۲)

عبداللہ بن معتز فن موسیقی سے خوب واقف تھا، اور راگوں کے حقائق اور علل کا بھی اسے پورا علم تھا،

عبداللہ بن طاہر کے لڑکے اور بنی حمدان سے اس سلسلہ میں اس سے تحریری مناظرے بھی ہوئے تھے، آخر میں اُس نے ایک لمبا خط بلکہ رسالہ عبداللہ بن عبداللہ کے ذریعہ بنی حمدان کے پاس لکھا، جس کے جواب میں عبداللہ بن عبداللہ نے ایک خط لکھا، اور اس کے فضل و کمال کا اعتراف کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں :-

قرأت ایدک اللّٰہ الرسالة الفاضلة البارعة الموفقة فانا واللّٰہ اقرأها الی آخرها ثم اعود الی اولها مبتهجا وآمل واعود مبتهلاً ...... ولا واللّٰہ ما رأیت جداً فی هزل ولا هزلاً فی جد یشبه هذا فی بلاغته وفصاحته وامارة برهانه وجزالة الفاظه، (اغانی جلد ۹ صفحہ ۱۴۴)

خدا تمہاری مدد کرے، میں نے تمہارا فاضلانہ انشا پردازانہ فصیح و بلیغ اور برجستہ رسالہ پڑھا، خدا کی قسم میں نے اُسے آخر تک پڑھا، اور پھر لطف اندوزی کے لئے دوبارہ پڑھا، اسی طرح بار بار پڑھا ہوں، اور خوش اور لطف اندوز ہوتا ہوں، میں نے کلام میں جد و ہزل کی ایسی آمیزش نہیں دیکھی جو اپنی فصاحت و بلاغت اور برجستگی اور شوکت الفاظ میں اس کے مشابہ ہو،

علم بدیع | عبداللہ بن معتز علم بدیع کا موجد اور امام ہے، اسی نے سب سے پہلے محاسن کلام کے مسائل کا استقصا کر کے اس کو فن کی حیثیت سے مدون اور مرتب کیا، اور اس فن کا نام بھی بدیع رکھا،

سید صدر الدین شیرازی اپنی کتاب انوار الربیع فی انواع البدیع مین لکھتے ہین،

اوّل من اخترعه وسماه بهذا	سب سے پہلے عبد اللہ بن معتز نے اس فن
التسمية عبد الله معتز العباسي[1]	کی ایجاد کی، اور اس کا نام بدیع رکھا،

علم بدیع معانی وبیان ہی کی ایک فرع ہے لیکن تدوین کے لحاظ سے فرع کو اصل پر تقدم حاصل ہے، معانی وبیان کے متعلق صاحب طراز اور دوسرے اہلِ فن کی تصریح ہے، کہ فنی لحاظ سے اس کے موجد اور مدوّن عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) ہین لیکن علم بدیع کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس کا پہلا موجد اور مولف عبد اللہ بن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) ہے، چنانچہ صاحب کشف الظنون لکھتے ہین :-

کتاب البدیع لابی العباس عبد اللہ	کتاب البدیع ابو العباس عبد اللہ
بن معتز العباسی متوفی سنه ۲۹۶ھ	ابن معتز العباسی متوفی ۲۹۶ھ کی تصنیف
وهو اول من صنف فیه وكان	ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فن مین
جملة ما جمع منها سبعة عشر	سب سے پہلے تصنیف کی ہے، پوری کتاب
نوعا (کشف الظنون علم البدیع)	مین سترہ ابواب ہین،

پہلے عبد اللہ بن معتز کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اُس نے اس فن کی اصل کی تدوین سے پہلے اس کی فرع کی تدوین کا کام انجام دیا، جس کی مثال تاریخ تدوین فنون مین نہین ملتی،

تصانیف ابن ندیم اور ابن خلکان نے اس کی گیارہ تصانیف کے نام لکھے ہین،

(۱) کتاب الزہر (۲) کتاب البدیع (۳) کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر (۴) کتاب الجوارح والصید (۵) کتاب السرقات (۶) کتاب اشعار الملوک (۷) کتاب الآداب (۸) کتاب حلی الاخبار

[1] مقدمہ انوار الربیع ص ۲،

(۹) کتاب طبقات الشعراء (۱۰) کتاب الجامع فی الغناء (۱۱) کتاب ارجوزة فی ذم الصبوح،

اہلِ تذکرہ نے اس کے دیوان کا ذکر نہین کیا ہے، جو یورپ مین چھپ گیا ہے، اور جس کے متعدد قلمی نسخے بھی یورپ کے مختلف کتب خانون مین موجود ہین[1]،

ان کتابون مین جو کتابین قلمی یا مطبوعہ موجود ہین، اُن کے متعلق کچھ تفصیلی معلومات پیش کئے جاتے ہین،

کتاب الادب اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم مین موجود ہے، مشہور عربی رسالہ مجمع العلمی (سنه ۱۹۳۶ء) نے لکھا ہے کہ اس کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانون مین پائے جاتے ہین اور اب وہ چھپ بھی گئی ہے، یہ کتاب سب سے پہلے ایک روسی عالم کراچکوفسکی کے ذریعہ ظہور مین آئی، اس نے بڑی عرق ریزی سے مختلف نسخون سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کی، اور فرنچ مین ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ اسے مجلہ شرقی مین جستہ جستہ شائع کیا، اس کے بعد وہ اس رسالہ سے جو اسی کے متعلقات مین سے ہے، کتابی شکل مین شائع ہوگئی ہے،

کتاب کے سنہ تصنیف کے متعلق خود ابن معتز نے مقدمہ مین لکھا ہے کہ

وقد الفته سنه ۲۷۴ھ واول	مین نے اُسے ۲۷۴ھ مین تصنیف کیا،
من نقل عنی علی بن هارون	سب سے پہلے علی بن ہارون منجم نے مجھ سے
المنجم (مجمع العلمی ۱۹۳۶ء)	اس کو نقل کیا،

اس کی ضخامت پچاس ساٹھ صفحات سے زیادہ نہین ہے، لیکن یہ کتابچہ اپنی معنویت کے اعتبار سے بڑا وزنی اور قیمتی ہے،

اس کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ کتاب زبان ولغت کے متعلق ہوگی، لیکن ادب ولغت سے نہین بلکہ ادب نفس

[1] تاریخ ادب جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۶۳،

یعنی اخلاق و موعظت اور حکم و مصائح سے متعلق ہے،

اس کے دیکھنے سے عبد اللہ کی انشاء پردازی اور نثر مین اس کی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، بعض فقرے یہان نقل کئے جاتے ہین،

انّ اھل الدنیا کصور فی صحیفۃ کلما نشر بعضھا طوی بعضھا ما ادری ایھما امر موت الغنی او حیاۃ الفقیر؟ العتاب حیاۃ المودۃ، التواضع سلم الشرف، یستحق الانسانیۃ من حسن خلقہ، کان الحاسد خلق لیغتاظ، کما ان جلاء السیف اھون من صنعہ کذالک استصلاح الصدیق اھون من اکتساب غیرہ من عدد نعمہ محق کرمہ، من یعرولیق فی نفسہ صاتیمنا ولاعدائہ، علم الانسان ولدہ المخلد، الاسخیاء یعبد ھم المال والبخلاء یعبد ونہ،

کتاب البدیع اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ فن بدیع کی پہلی کتاب ہے، اس مین کل ۱۰ ابواب ہین، ۲۷۴ھ کی تصنیف ہے، خود عبد اللہ بن معتز نے کتاب کے مقدمہ مین ان باتون کی تصریح کر دی ہے[1]

وما جمع قبلی فنون البدیع احد	مجھ سے پہلے کسی نے اس فن کو مدون
ولا سبقنی الی تالیفہ مؤلف	کیا، اور نہ کسی مؤلف نے مجھ سے پہلے
الفتہ فی سنۃ اربع وسبعین	اس فن پر کوئی تصنیف چھوڑی ہے، مین نے
ومائتین[1]	اسے ۲۷۴ھ مین تصنیف کیا،

صاحب کشف الظنون نے کتاب الادب کا سنہ تصنیف بھی ۲۷۴ھ ہی لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی سال ایک کتاب کا آغاز اور ایک کا اختتام ہوا ہو،

مقدمۂ کتاب مین اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مین نے محاسنِ کلام کے جو اقسام و انواع

[1] مقدمہ انوار الربیع ص ۲،

مرتب کئے ہین، اگر کوئی شخص ان ہی پر اکتفا کرنا چاہے، تو اس کے لئے یہ کافی ہین، لیکن اگر کوئی اس مین کچھ اضافہ کرے یا میری راے سے اختلاف کرے، تو اس کو اس کا اختیار ہے[1]

اسکوریال کے کتب خانہ مین اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، (تاریخ ادب ج ۲ ص ۱۹۳)

طبقات الشعراء ابن ندیم اور ابن خلکان نے کتاب طبقات الشعراء کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اسکوریال کے کتب خانہ مین اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اس پر کتاب کا نام "کتاب مختصر طبقات الشعراء" لکھا ہوا ہے[2]

کتاب اشعار الملوک مستشرق الہوارٹ کے کتب خانہ مین اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے[3]

دیوان عبد اللہ بن معتز کے دیوان کے متعدد قلمی نسخے پیرس و قاہرہ کے کتب خانون مین موجود ہین،

دیوان صنفِ شاعری کے اعتبار سے علحدہ علحدہ ابواب مین حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے، اس دیوان کا راوی محمد بن یحییٰ الصولی ہے، ۱۸۹۱ء مین مصر کے شاہی مطبع مین طبع ہوا، پھر مطبع الخسیہ بیروت نے ۱۹۱۳ء عیسوی مین دوبارہ اسے اپنے مطبع سے شائع کیا،

اس دیوان کے علاوہ برلن اور غوطہ کے کتب خانون مین اس کے کچھ قصائد کا بھی سراغ ملتا ہے، لیکن وہ اب تک منظر عام پر نہین آئے ہین،

جن کتابون کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن کے علاوہ پیرس کے کتب خانہ مین کتاب الشراب کے نام سے اور برلن کے کتب خانہ مین کتاب التماثیل فی تباشیر السرور کے نام سے دو قلمی کتابین ملتی ہین، جن پر مصنف کی جگہ عبد اللہ بن معتز کا نام ہے[4]، لیکن قدیم مورخین مین سے کسی نے

[1] مقدمہ انوار الربیع ص ۲، [2] تاریخ ادب جرجی زیدان ج ۲ ص ۱۹۳ [3] ایضاً [4] ایضاً،

بھی عبد اللہ کی تصنیفات میں ان کتابوں کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے عبد اللہ بن معتز کی طرف ان کتابوں کی نسبت مشتبہ ہے،

ارجوزہ | اوپر ابن خلکان وغیرہ کے حوالہ سے "ارجوزہ فی ذم الصبوح" کے نام سے ایک کتاب کا ذکر آچکا ہے، صاحب معجم البلدان نے اس کی ایک کتاب ارجوزۃ فی تاریخ المعتضد باللہ کا ذکر بھی کیا ہے، جو ۱۹۱۰ء میں مطبع الجمالیہ میں طبع ہوگئی ہے، نام سے قیاس ہوتا ہے کہ خلیفہ معتضد عباسی کے دور حکومت کے واقعات اور اس کے ذاتی حالات پر مشتمل ہوگی،

تاریخ صقلیہ اوّل

اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سلی، اٹلی وجہ اثر سلی پر اسلامی حملوں کی ابتداء اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلا وطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت صہ

تاریخ صقلیہ دوم

یہ سلی کے اسلامی عہد کا تمدنی مرقع ہے، اس میں مختلف علوم، قرآن، حدیث، فقہ تصوف، تاریخ، کلام، مناظرہ، شعر و شاعری، علوم عقلیات، ریاضیات و طبعیات کا تذکرہ ایک ایک فصل میں ہے، اور انہی میں مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیہ متکلمین، ادبا اور شعرا کے مفصل سوانح حیات ان کی تصنیفات اور کلام نثر و نظم کا ذکر ہے آخری باب سلی کے اسلامی تمدن سے یورپ کے استفادہ کے متعلق ہے، قیمت صہ

اُردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصّہ

از
جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی

(۴)

۸۳۔ "شرمول" پشتو میں شرمندہ کرنے کو کہتے ہیں، اور "شرموئے" کے معنی ہیں شرمندہ کیا ہوا، ہمارے یہاں شرمندگی کو "شرمول" اور "شرمولی" بولتے ہیں،

۸۴۔ "شرنگ" پشتو میں جھانجن اور پازیب جیسے زیور کی آواز کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں یہ "شرنگ" ہو گیا ہے، اور اگر کوئی عورت کڑے کو کڑے سے بجاتی چلے تو کہا جاتا ہے کہ "شرنگ شرنگ کرتی آرہی ہے"

۸۵۔ ایسے کام کو جو کبھی سنا نہ گیا ہو پشتو میں "شندہ" کہتے ہیں، یہاں بھی لوگ انوکھے کام کو کہتے ہیں، "میاں عجب شندہ ہے" یا کیوں جی یہ کیا شندہ کیا؟

۸۶۔ پشتو ہی کا ایک اور لفظ "شہر" ہے جس کے معنی نا کردنی کام کے ہیں، کسی سے اگر ایسا کام سرزد ہو جائے اور لوگوں میں عام بدنامی ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ "فلاں بڑا شہرہ شرمندہ ہوا" اس محاورہ کا لفظ شہرہ دہی پشتو شہر ہے،

۸۷۔ "شیبہ" بیای مجہول، پشتو میں تیز بارش کو کہتے ہیں، رامپور میں عورتیں کہا کرتی ہیں، "شیبوں مینھ پڑا"،

۸۸۔ تیز بخار کو پشتو میں "شبرہ" کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی یہ لفظ عام تھا، مگر اب اس کا رواج کم ہوتا جاتا ہے،

۸۹۔ "غاؤ" پشتو میں شور کو کہتے ہیں، رامپور میں ننھا بچہ جو آوازیں نکالتا ہے اسے "غاؤ غاؤ" یا "غاغو، کرنا" کہتے ہیں،

۹۰۔ "غٹ" اور "غٹہ" پشتو میں بڑے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بڑی جون "غٹہ" کہلاتی ہے،[۱]

---

[۱] آغا حیدر حسن صاحب (پروفیسر نظام کالج حیدر آباد) فرماتے ہیں کہ عام اردو میں موٹی جوں کو "غٹا" کہتے ہیں،

۹۰۔ "مئے" پشتو میں مجوے کا مترادف ہے، اور مجوعہ امراض شخص کو "آزار غنے" کہتے ہیں، یہ مرکب لفظ رامپور میں بھی مروج ہے،

۹۱۔ "غرانگہ" پشتو میں بلند آواز کہلاتی ہے، یہ فارسی لفظ "غرنگ" کا ہمقوم ہے، جس کے معنی ہیں "آواز جو روتے وقت گلے سے نکلتی ہے"، روہیلکھنڈ میں "غرانگہ" بولتے ہیں،

۹۲۔ غرنب، فارسی میں غرانے کو، اور "غرنب" پشتو میں گرج اور شور کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں اس سے مراد پانی کی وہ آواز ہوتی ہے، جو کسی بھاری چیز کے کنوئیں، تالاب یا کسی ندی میں گرنے سے پیدا ہوتی ہے،

۹۴۔ "غلبلہ" پشتو میں ملک کی بدنظمی یا غدر کو کہا جاتا ہے، روہیلکھنڈ میں اس سے ایک مصدر "غلبلانا" بنالیا ہے، اور ایک یا بہت سے آدمی شور و شر مچاکر کسی کو گھیر لیں اور وہ اس گھبراہٹ میں ان کے حسب منشا کام کرلے تو کہا جاتا ہے کہ "وہ بیچارہ کیا کرتا، سب نے مل کر اسے غلبلا لیا"[1]

۹۵۔ غدود، رسولی یا سخت ورم کو افغانستان میں "غمبر" کہتے ہیں، ہمارے یہاں کسی کے پیٹ میں ریاح بھرے ہوں جس کے باعث آنتوں میں سختی کا احساس ہو رہا ہو تو کہا جاتا ہے کہ "آج پیٹ غم سے یا غم ہے"،

۹۶۔ غندارے بھی پشتو میں ایک قسم کی رسولی کہلاتی ہے، جو اکثر گردن کے پچھلے حصہ پر نکلتی اور باعث ہلاکت ہو جاتی ہے، روہیلکھنڈ میں کسی کے پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور ان کے ساتھ ورم بھی ہو جائے تو کہتے ہیں "غندارے نکل رہے ہیں" عورتیں کوستی ہیں تو کہتی ہیں، "زبان میں غندارے نکلے"

۹۷۔ گرہ یا عقدے کو پشتو میں "غوٹہ" (بواو معروف) کہتے ہیں، ہمارے یہاں افیون کی بڑی گولی کو افیون کا غوٹہ (بواو مجہول) کہتے ہیں،

---

[1] آغا حیدر حسن صاحب کا ارشاد ہے کہ غلبلانا قدیم دکھنی میں بھی مستعمل ہو،

۹۸۔ پشتو کا ایک اور لفظ ہے "غوٹہ" بواو مجہول، اس کے معنی ہیں بے ہوشی، مستورات رامپور نے اسے مخفف کر کے "غشہ" بنالیا ہے اور مرض کی سختی سے کوئی بے ہوش ہو جائے تو "غشہ پڑگیا" کہا جاتا ہے،

۹۹۔ قارے دریاب، قہرے دریاب، قالی دریاب" یہ تین لفظ پشتو میں سمندر کیلئے استعمال ہوتے ہیں، روہیل کھنڈ میں "قار دریاب" سے پانی کی زیادتی کو ظاہر کیا جاتا ہے،

۱۰۰۔ "قاشوقہ" اور "قاشوغہ" چمچے کو کہتے ہیں، یہ ترکی "قاشق" سے بنا ہے، میرے بچپن تک روہیلکھنڈ کے شہروں میں بھی اور دیہات میں ابتک "قشوقہ" اس چمچے کو خاص طور پر کہا جاتا تھا جو چینی کا بنا ہوتا تھا اور آگے سے چوڑا اور ڈنڈی شاما چڑیا کی دم کی طرح اوپر کو اٹھی ہوا کرتی تھی، جب اس کا چلن نہ رہا، تو دوسری وضع کے چمچے کو بھی قشوقہ ہی کہنے لگے، اب شہروں میں عام طور پر چمچہ بولتے ہیں،

۱۰۱۔ "قچر" اور "خچر" پشتو میں خچر کو کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں مخلوط النسب کو "قچر خیل" اور "خچر خیل" کہا جاتا ہے،

۱۰۲۔ "قلار قلار" کے معنی پشتو میں "آہستہ آہستہ" یا سکون کے ساتھ ہیں، یہ عربی لفظ "قرار" کا بگاڑ ہے، ہمارے علاقہ میں کہا جاتا ہے "یہ بچہ بڑا قلار ہے" یعنی پر سکون ہے، اور "قلار قلار دیکھ رہا ہے" یعنی نرمی، آہستگی یا محبت طلب نظروں سے دیکھ رہا ہے،

۱۰۳۔ "قصاب" کو پشتو میں "قصاب" کہتے ہیں، ہم لوگ "بز قصاب" کو "بکر قصاب" اسی پشتو کے اثر کے تحت بولتے ہیں،[1]

---

[1] لیسٹ کی کتاب "ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کی اقوام کی تاریخ کہانیوں اور بھیلا ئریا وداشتیں" ج ۲ ص ۱۹۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد، ہمیر پور اور بنارس میں گائے کا گوشت فروخت کرنے والے بکر قصاب کہلاتے ہیں، جو اصل میں بقر یعنی گائے سے مرکب ہے، ہمارے یہاں کا بکر قصاب بکری کے مخفف اور قصاب کی ترکیب سے بنا ہے،

۱۰۴۔ "قیزہ" پشتو میں ایک قسم کی لگام کہلاتی ہے جسے انگریزی میں Watering bridle کہتے ہیں، رامپور میں اسے قیزہ اور قیزئی بولتے ہیں،

۱۰۵۔ "کاچو" پشتو میں چاقو کی مقلوبی شکل ہے، اور چاقو خود بھی پشتو ہی میں چاقو سے بنا ہے، روہیلکھنڈ میں چاقو کو "چکو" کر لیا ہے،

۱۰۶۔ "کاواک" پشتو میں بیکار اور خالی کو کہتے ہیں، رامپور میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور لوگ کہتے ہیں "کاواک بیٹھا ہے" یا "کاواک پھر رہا ہے" یا "آجکل دل کاواک سا ہے" ان مواقع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بیکاری کے التزامی معنی، گھبراہٹ، اچاٹ پن اور پریشانی مراد لی جاتی ہے،

۱۰۷۔ "کرے" پشتو میں کتے کے بھگانے کی آواز ہے، روہیل کھنڈ میں بھی یہی دھتکار مستعمل ہے ایک لفظ اور بھی بولا جاتا ہے، "کور کور" یہ کتے کے پلے کو بلانے کیلئے وضع ہوا ہے، میری رائے میں یہ بھی اسی لفظ کے پیش نظر روہیلکھنڈیوں نے بنایا ہے،

۱۰۸۔ "کروہ وڑہ" پشتو میں شان و شوکت، سجاوٹ اور زیبائی کہلاتی ہے، رامپور میں ننھا بچہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا دل بڑھانے کیلئے ماں وغیرہ کہتی ہے "میرا بچہ کھڑا بڑا" کبھی کبھی "کھڑے سے بڑا" بھی بولا جاتا ہے، یہ ہمت افزائی اور کہیں سننے میں نہیں آئی، نہ کسی لغت میں اس کا مذکور ہوا ہے، اس سے میں خیال کرتا ہوں کہ "کھڑا بڑا" اسی پشتو "کروہ وڑہ" سے بنا ہے،

۱۰۹۔ جو روٹی کو ملون پر پکائی جائے اسے پشتو میں "گگوڑے" بواو مجہول کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں روٹی جل جائے تو کہا جاتا ہے کہ "جل کے گگوڑا ہو گئی"

حاسد کو ہمارے یہاں "جل گگوڑا" کہتے ہیں، یہ بھی اسی سے بنا معلوم ہوتا ہے،

۱۱۰۔ "گگلمہ" پشتو میں انت کہلاتی ہے، رامپور میں نسائیت جس لڑکے میں پائی جاتی ہے اسے

دوسرے لڑکے "ادئی تیرے گلے میں سوئی" کہکر چھیڑتے ہیں،

۱۱۱۔ "گنڈولے" پشتو میں "کونڈی" کو کہتے ہیں، اس میں تغیر کر کے روہیلکھنڈ میں کنڈیلی اور گنڈیلیا بنا لیا ہے،

۱۱۲۔ "کوٹک" بواو مجہول افغانستان میں سر کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں، ہمارے یہاں کسی کا ماتھا ابھرا ہو تو کہا جاتا ہے کہ "کوٹک نکلا ہوا ہے" غالباً پہلے "کوٹک سا نکلا ہوا ہے" کہتے ہونگے، رفتہ رفتہ "سا" گر گیا ہو،

۱۱۳۔ رامپوری مستورات کا ایک کوسنا ہے "کوٹہ کریاب رہ جائے" کبھی ازراہ تحقیر کہا کرتی ہیں، "ہے کیسی کوٹہ کریاب" کوئی لڑکی کنواری بیٹھی ہو تو اسے بھی کہتی ہیں کہ "کوٹہ کریاب بیٹھی ہے" یہ بھی پشتو لفظ ہیں،

"کوٹہ" پشتو میں بازاری کتا اور "کریاب" مردود یا راندہ کہلاتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اصل لفظ "کوٹِ کریاب" ہوں "کوٹ" گدھا کو کہتے ہیں، اور "کریاب" کے معنی ہیں چکی باندی، یا بے یار و مددگار

۱۱۴۔ "گوخچی" روہیل کھنڈ میں بالوں کی تیلی تپلی گندھی ہوئی لٹ کہلاتی ہے، یہ پشتو کے ایک لفظ "کونخی" کے حرف "خ" "کو چ" سے بدل کر بنایا ہے۔

۱۱۵۔ "گونسٹہ" پشتو میں بنیاد کو کہتے ہیں، اور "گونسٹہ دِ دُ خیزہ" افغانی کوسنا ہے یعنی تیرا ستیاناس جائے، رامپور میں "گنسٹہ نکل گیا" بولتے ہیں، اور مراد تباہی و بربادی ہوتی ہے،

۱۱۶۔ ہمارے یہاں کی عورتیں اپنی مصیبت یا دکھ کی شدت ظاہر کرتے ہوئے کہا کرتی ہیں، "میرا تو اس غم میں گوگل لگ گیا" یہ "گوگل" بھی پشتو ہے اور چھاتی یا سینے کا مترادف ہے،

۱۱۷۔ روہیل کھنڈ میں گھیر رہنے کے نام زیادہ تر ہوتے ہیں، مثلاً صید خاں کا گھیر مراد آباد میں اور سیف الدین خاں کا گھیر رامپور میں مشہور ہیں، دستور یہ تھا کہ ایک سردار اپنے عزیز و اقربا اور نوکر چاکر وغیرہ کیلئے ایک حصۂ زمین مخصوص کر کے صدر میں اپنے محلات در آس پاس متعلقین کے مکان بنواتا تھا اور

قریب ہی بھنگی، بہشتی، تیلی، تنبولی، دھنئے اور نائی وغیرہ کو بساتا تھا جو ہر وقت اوس سردار اور دوسرے اہلِ محلہ کی خدمت کیا کرتے تھے، سردار کے مکان کے سامنے مدور قطعۂ زمین چھوڑا جاتا تھا، اس محلے کو دوسرے شہری اس سردار کا گھیر کہکر پتہ دیا کرتے تھے،

پشتو میں اس وضع کی آبادی کو "گیر" کہا جاتا ہے، جب یہ لفظ روہیلکھنڈ میں وارد ہوا، تو لوگوں نے اسے ہندی شکل "گھیر" سے بدل لیا، اگر محلے کیلئے گھیر ہندی میں بھی بولا جاتا ہوتا، تو ہندوستان میں ہر جگہ محلوں کے نام کا جز نظر آتا، حالانکہ خود روہیلکھنڈ میں بھی کسی ہندو کا گھیر نہیں پایا جاتا،

۱۱۸۔ پشتو میں ناہم، اتبک، ورنہ، یقیناً وغیرہ کی جگہ "لا" بولتے ہیں، رامپور میں بھی جاہل کہا کرتے ہیں "لا" میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ سب تمہارے منتظر ہیں، مگر اس نے ذرا پروا نہ کی" اس "لا" میں "بلکہ" کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے،

۱۱۹۔ "لاوارثہ" پشتو میں بے یار و مددگار عورت کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی عورتیں کہتی ہیں "خدا مجھ سی لاوارثہ کسی کو نہ کرے"

۱۲۰۔ "لالے" پشتو میں پیار سے بچے کو کہا جاتا ہے، رامپور اور بریلی وغیرہ میں "لالا" کہتے ہیں، میرے چچا استاد سہراب خاں کو ان کے بڑے اب تک "لالا" کہتے ہیں، حالانکہ وہ خود پوتی پوتا والے ہو چکے ہیں[1]

۱۲۱۔ "لر" "بر" پشتو میں نیچا اور "بر" اونچا کا ہم معنی ہے، "لر بر کتل" چاروں طرف دیکھنا یا دیکھ

[1] جناب اعجاز حسین صاحب ضامن فرماتے ہیں کہ بمبئی میں پشاوری لوگ لالہ کہکر پکارا جاتا ہے، ممکن ہو کہ کوئی صاحب اسے بنیوں والا لقب خیال کریں کیونکہ اکثر افغانی سود کا کام کیا کرتے ہیں جو ہندوستان میں دوسرے لوگوں ہی کا خاص پیشہ ہے، مگر میں اس خیال کو درست نہیں مانتا جو لوگ افغانیوں کے مزاج سے واقف ہیں وہ میری اس رائے سے موافقت کریں گے کہ افغانی سے یہ کبھی برداشت نہ ہو سکے گا کہ اسے اس لقب کے ساتھ پکارا جائے جو اس کی نظر میں غیر مسلم کے ساتھ مخصوص ہو، وہ جو اپنے آپکو ہنسی خوشی "لالا" کہلوا لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ "لالہ" تو وہی پشتو کا پیار کا لقب ہے جس سے اسکے کان ہمیشہ کے آشنا ہیں،

ٹمکانا کہلاتا ہے، ہمارے یہاں شوخ و شنگ لڑکی کو "لر بر دیدہ" کہتے ہیں، اور کوئی لڑکی یا لڑکا ڈھیٹھ پن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بڑوں سے بات کرتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ "اس کا تو دیدہ لر بر نہیں ہوتا" یا یہ لڑکی تو لر بر نہیں ہوتی،

۱۲۲۔ لرزہ کو پشتو میں "لڑزہ" بھی بولتے ہیں، اسی طرح درد اور مرد کی "ر" بھی "ڑ" سے بدل جاتی ہے، رامپور میں بھی ان تینوں لفظوں کو پشتو کے لہجے کے مطابق بولا کرتے تھے، اب صرف ان پڑھوں کی زبان پر آجاتے ہیں،

۱۲۳۔ "تشمکی" پشتو میں چالاک عورت کو کہتے ہیں، یہ اردو میں پشتو کے ایک اور استعمال ہونیوالے لفظ "شتّاہ" کا مترادف ہے، رامپور میں بھی اس کا چلن ہے، مگر شتّاہ سے کم،

۱۲۴۔ رامپور کی مستورات "دربدر" کی جگہ "لوڑ بہ لوڑ" کہا کرتی ہیں، یہ بھی پشتو ترکیب ہے، "لوڑ" بواو مجہول پشتو میں طرف، جہت یا سمت کہلاتی ہے،

۱۲۵۔ "مٹاکہ" پشتو میں اس ورم کو کہتے ہیں جو کسی زہریلے جانور کے کاٹے سے پیدا ہو جاتا ہے، رامپور میں کسی وجہ سے بھی موٹے موٹے ددوڑے پڑ جائیں تو انہیں "مٹاکہ" کہتے ہیں،

۱۲۶۔ "مشادہ" پشتو میں بدشکل یا بد مزاج عورت کہلاتی ہے، روہیلکھنڈ میں بھی اس کا چلن ہے، اور عورتیں کہا کرتی ہیں، "ہے کیسی مشادہ" یا "جب دیکھو مشادہ سی کھڑی ہے"

۱۲۷۔ "ماس پشین، ماز دیگر، ماس خفتن" ظہر، عصر اور عشاء کی نماز کو پہلے بڑے بوڑھے بولا کرتے تھے، اب یہ لفظ سننے میں نہیں آتے، لیکن ایک محاورہ ابھی تک مستورات کے زبان زد ہے، یعنی "وہ پہلی ماخام کی ہریان ہے" یا کسی کنواری لڑکی کو کوستے ہوئے کہتی ہیں "تو پہلی ماخام کی ہریان رہ جائے" یہ ماخام بھی پشتو ہے، اور نماز شام سے بنا ہے، اس سے مغرب کا وقت اور نماز دونوں مراد ہوا کرتے ہیں، مگر ان محاوروں میں شادی کی پہلی رات مراد ہے،

۱۲۸۔ "تابڑ" اور "تاپڑ" پشتو میں موٹے اور بھدے اعضا والے کو کہتے ہیں، رامپور اور روہیلکھنڈ کے دوسرے حصوں میں آخری شکل مروج ہے،

۱۲۹۔ "میرات" بیائے معروف پشتو میں لاولد کو کہتے ہیں، رامپور میں "مراتی" اور "مراتن" ترحم اور خفگی دونوں حالتوں میں بولے جاتے ہیں، زنانہ بول چال ہے، "تُجھے تو مراتی، ابھی تیری خبر لیتی ہوں" یا "وہ مراتن کیا جانتی تھی کہ ذرا دیر میں شوہر آنکھ پھیر لے گا"،

اسی لفظ سے ذرا تخفیف کرکے "مرات ہونا" محاورہ بنا لیا ہے، اور کہا جاتا ہے "سارا گھر مرات ہوگیا" یعنی تباہ و برباد ہوگیا، عورتوں کا ایک کوسنا بھی ہے "تو مرات ہوجائے" یا "تجھے مرات کرکے رکھ دوں" یا "کر ڈالوں"۔

۱۳۰۔ لفظ "نا" کے مرکبات "ناحقی، ناحقی کرنا، نامردہ" بھی پشتو ہی سے آئے ہیں، آخری لفظ کے متعلق اتنا اظہار ضروری ہے کہ افغانستان میں یہ مؤنث کیلئے بولا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ہائے مختفی پر ختم ہونیوالے پشتو کے دوسرے لفظوں کی طرح مذکر کیلئے استعمال ہونے لگا ہے،

۱۳۱۔ انوکھی یا نادر چیز کو پشتو میں "نادیات" کہا جاتا ہے، رامپوری مستورات کہا کرتی ہیں "یہ لڑکی ہے کیسی نادیات" یا "فلاں چیز ایسی نادیات تو نہیں کہ کہیں ملے گی ہی نہیں"

۱۳۲۔ "نغارہ" پشتو میں نقارے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈ میں بھی اس کا رواج ہے، بلکہ بعضے "نقارہ" بھی بولتے ہیں، اب کا پتہ نہیں لیکن تیس برس ادھر تک جبکہ میں مکتب میں پڑھا کرتا تھا، بچے آپس میں کہا کرتے تھے "الف بے تے ثے نغارہ، دن چڑھتے گیدڑ مارا"

۱۳۳۔ "تنگ یالا" اور "تنگ یالی" روہیلکھنڈ میں علی الترتیب تنگ و شرم والے مرد اور عورت کو کہتے ہیں، یہ پشتو کے "تنگ یالے" اور "تنگ یالئی" کی شکلیں ہیں، (باقی)

وفیات

سید حسین کی موت

۲۵ فروری ۱۹۴۹ء کی رات کو ۹ بجے ریڈیو نے خبر سنائی کہ ہندوستانی سفیر متعین مصر سید حسین نے وفات پائی، دوسرے دن شاہانہ تزک و احتشام سے سرکاری طور سے اُن کی تدفین عمل میں آئی جنازہ میں شاہ فاروق نے شرکت کی، اور بعض علمائے ازہر نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی،

شاید لوگوں کو یاد ہو کہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے مجلس خلافت کا جو وفد یورپ بھیجا گیا تھا، اس کے ابتدائی ممبر تین تھے، محمد علی مرحوم، سید حسین اور سید سلیمان ندوی اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین قدوائی، اور ابو القاسم (بنگال کے نامور لیڈر) بھی شامل ہوگئے، افسوس کہ اس وقت راقم کے سوا سب ہی جنت کو سدھار سے، اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات صاحب تھے، جو بحمد اللہ اس وقت بھی بقید حیات ہیں، اور یہیں بھوپال میں اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کے سکریٹری ہیں، سید حسین کی موت کی خبر سنتے ہی میں نے حیات صاحب کو فون کیا، وہ بھی خبر سن چکے تھے، کچھ دیر تک مرحوم کی وفات پر ہم دونوں افسوس کرتے رہے،

وہ اس وقت گو جوان نہ تھے، ۶۲ برس کی عمر تھی، مگر چہرہ مہرہ اور بالوں کی سیاہی سے اب تک جوان بنے تھے، اُن کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، مصر کے تازہ آنے والوں سے سنا کہ ان کی صحت اخیر دنوں میں اس حد تک گر چکی تھی کہ ان کا کسی وقت بھی ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لینا تعجب خیز نہ تھا،

مرحوم بہار و بنگال کے ایک ممتاز سادات کے گھرانے میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ اُردو کے مشہور ظریف

انشا پرداز سید محمد آزاد کے چھوٹے بیٹے تھے، سید محمد مرحوم اس زمانہ میں جب بہار و بنگال ایک تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے، ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ لکھنؤ اور البنچ پٹنہ میں چھپتے تھے، اور بعد کو ان کے مضامین الگ بھی چھپے، اپنے زمانہ کے مشہور ادیبوں میں ان کا شمار تھا،

سید حسین نے ابتدائی تعلیم کے بعد انگلستان کی راہ لی، شعر و سخن اور ادب و انشا کی گودوں میں انھوں نے پرورش پائی تھی، گو وہ انگریزی کے ادیب و انشا پرداز تھے لیکن اردو شعر و ادب میں بھی ان کو خاصہ ملکہ تھا، اور جس روانی سے انگریزی میں تقریر کرتے تھے، اردو میں بھی کرتے تھے، بڑے زندہ دل، ہنس مکھ اور باغ و بہار تھے،

انگلستان میں جا کر انھوں نے اخبار نویسی سیکھی اور ۱۹۱۴ء والی بڑی لڑائی کے بعد جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کا طوفان اٹھا وہ ہندوستان آئے، اور پہلے مسٹر ہارنی مین کی نگرانی میں بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے، اور اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب موتی لال جی نہرو آنجہانی نے الہ آباد سے انڈپنڈنٹ نکالا تو اس کی اڈیٹری کے لئے اسی نوجوان صاحب قلم کا انتخاب کیا، اور ان کو خود اپنے پاس رکھا، انڈپنڈنٹ کی شہرت کے ساتھ ساتھ سید حسین نے بھی شہرت حاصل کی، ان کو میں نے اسی زمانہ میں بعض قومی سیاسی جلسوں میں دیکھا، گورا رنگ، چھریرا بدن، بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس، اور یہی اخیر تک ان کا فیشن رہا، اسی زمانہ میں جلسوں میں ان کی طرف نگاہیں اور انگلیاں اٹھتی تھیں،

یہ وہ وقت تھا کہ کانگریس اور خلافت کے اتحاد سے ملک میں سیاسی بیداری کا سیلاب برابر بڑھتا جا رہا تھا، اور آخر شکست خوردہ ٹرکی کے حصہ بخرہ کرنے کی تجویزیں فاتح اتحادیوں میں پیش تھیں کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت کے اس اجلاس میں جو کانگریس کے ساتھ امرتسر میں ہوا تھا اور جس میں علی برادران نظربندی سے رہا ہو کر پہلی بار شریک ہوئے تھے، یہ طے ہوا کہ محمد علی کی قیادت میں سید حسین اور سید سلیمان ندوی کا وفد انگلستان اور یورپ کے دوسرے دار الحکومتوں میں اس غرض سے بھیجا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کا اور ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کرے، محمد علی مسلمانوں کے اور سید حسین ہندوستان کے اور سید سلیمان علمائے دین

کے نقطۂ نظر کو پیش کریں، اس کے علاوہ گاندھی جی نے سید حسین کو اپنے نوٹ بھی لکھوا دئے تھے کہ وہ ان کو وزرائے برطانیہ کے سامنے اپنی طرف سے پیش کریں جن میں ہندوستان کے نقطۂ نظر سے مسئلہ خلافت کی توضیح تھی، چنانچہ سید حسین نے انگلستان کے جلسوں اور وزیروں کی ملاقاتوں میں اسی حیثیت سے اپنے فرض کو انجام دیا،

۳۱ جنوری ۱۹۲۰ء پہلا دن تھا جب وفد خلافت کی یہ مختصر سی جماعت ہنگریا جہاز سے یورپ کو روانہ ہو رہی تھی، اسی تاریخ کی شام کو سید حسین سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سفر کا پہلا یا دوسرا دن تھا کہ شام کو محمد علی اور سید حسین میں انگریزی کی ایک ضرب المثل پر جو حقیقت میں ہابیل و قابیل کے سلسلہ میں توراۃ کا ایک فقرہ ہے کہ "میں اپنے بھائی کا رکھوالا نہیں ہوں" مناظرہ چھڑ گیا، سید حسین اس کی تائید اور محمد علی اس کی مخالفت کر رہے تھے، یہ حقیقت میں ان دونوں کی زندگیوں کے اصول اور عقیدہ کا اختلاف تھا، محمد علی قومی مسلمان سے مذہبی مسلمان بن چکے تھے جنکے نزدیک ہر مسلمان کا فرض تھا کہ دوسرے مسلمان کو غلطی سے روکے، اور سید حسین ابھی اس منزل سے پیچھے تھے، ان کے نزدیک شخصی آزادی کی یہ تھی کہ کسے را با کسے کارے نباشد، یہ مناظرہ بڑے جوش و خروش سے فریقین میں جاری رہا اور بڑی مشکل سے اس کو روکا جا سکا،

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے، اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اٹل اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لئے ان دونوں شیروں کو ٹھیک ٹھیک رکھنا بڑا مشکل تھا، یہ کام اس کو کرنا پڑتا تھا جو دونوں کے بیچ میں واو عطف کی طرح تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں کو غصہ جلد آ جاتا تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کر کے دونوں نے جس طرح ان آٹھ مہینے کی مدت کو خیر و خوبی کے ساتھ نباہا،

وفد خلافت ستمبر ۱۹۲۰ء میں یورپ میں اپنا کام ختم کر کے امریکہ جانے کا خیال کر رہا تھا کہ ہندوستان کے حالات نے اس کو ہندوستان لوٹنے پر مجبور کیا، اور تنہا سید حسین نے امریکہ جانے کا ارادہ کیا، چنانچہ ادھر وفد ہندوستان واپس ہوا اور ادھر سید حسین نے امریکہ کی راہ لی، امریکہ پہنچ کر انھوں نے ہندوستان

کی بڑی خدمت کی، اور امریکہ میں اپنی تقریر و تحریر سے انگریزوں کے پروپگنڈے کا جواب دیتے رہے، اور ہندوستان کی بھلائی کا کام کرتے رہے، امریکہ سے "نوائے وطن" کے نام سے ایک اردو کا اخبار بھی نکالا، اور اس سلسلہ میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۶ء تک گویا چوتھائی صدی امریکہ میں رہکر اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، اس درمیان میں دس بارہ برس ہوئے وہ چند ماہ کیلئے ہندوستان آئے تھے، ہندوستانی یونیورسٹیوں نے ان کی خاص طور سے قدر کی تھی اور لاہور سے دکن تک اکثر یونیورسٹیوں کی دعوت پر انھوں نے تقریریں کیں، پھر وہ امریکہ واپس چلے گئے، اور اخیر دفعہ وہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان واپس آئے، جب ہندوستان میں انگریز اپنی سیاست کا آخری تماشا دکھا رہے تھے، میری ان کی ملاقات ایک چوتھائی صدی کے بعد ۱۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ ملیہ کی جوبلی میں دہلی میں ہوئی، بڑی گرمجوشی سے مصافحہ ہوا، اور پچھلے گلے شکوے اور حکایات ہوئے، دوسری آخری ملاقات ۲۴ یا ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی دلی میں مولانا ابوالکلام صاحب کی کوٹھی میں ہوئی، جس کے بعد وہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی طرف سے مصر کے سفیر ہوکر مصر روانہ ہوئے، کام کیلئے صرف ایک سال کی مہلت پائی مگر سنا ہو کہ حکومت ہند نے ان کے کاموں کو پسند کیا،

مرحوم نے اپنی عمر تجرد ہی کی حالت میں گذاری، اس لئے ان کی کوئی ظاہری یادگار نہیں، اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ انگلستان اور امریکہ میں گذارا، اپنے ملک کو انکی قابلیت سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا،

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرحوم کے اعزہ بنگال اور کلکتہ میں موجود ہیں، ان کے دو بھتیجوں کی شادیاں ہمارے گاؤں (دسنہ ضلع پٹنہ) میں سادات کے گھرانے میں ہوئی ہیں۔

مرحوم کے ناتمام افسانۂ زندگی کی ان چند سطروں کے لکھنے کی حاجت نہ تھی، مگر میری انکی آٹھ ماہ کی رفاقت کے حق نے لکھنے کا تقاضہ کیا تاکہ اس مسافر عدم کی یاد اہل وطن میں تازہ ہو جائے ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"س"

مطبوعات جدیدہ

انگ ڈوٹس فروم اسلام

مؤلفہ جناب ابراہیم خانصاحب ایم، اے، بی، ال صدر ثانوی تعلیمی بورڈ، مشرقی پاکستان، ڈھاکہ، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ بہتر، ضخامت ۵۰۴، قیمت عـہ، پتہ: محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور،

جو قوم اپنے ماضی سے بے تعلق ہو جائے وہ مستقبل مین کوئی نمایان رفعت حاصل نہین کر سکتی، مگر عجیب بات ہے کہ دور ترقی اقوام مین عموماً اپنے ماضی سے بے نیازی کا رجحان پایا جاتا ہے، اس لیے ہر ترقی پذیر ملت کے صاحب دماغ اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے نوجوانون کے لیے ایسا لٹریچر مہیا کرین جو انھین ماضی سے وابستہ رکھے، یہ مقصد تاریخون سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، لیکن مسلسل اور خشک تاریخ کا مطالعہ بہتون کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے عوام کے علاوہ خواص خصوصاً طلبہ کے لیے ایسی کتابون کی سخت ضرورت ہے جس مین تاریخ اسلام کے جستہ جستہ سبق آموز واقعات دلچسپ انداز مین جمع کیے جائین تاکہ لوگ ان کو لطف و دلچسپی کے ساتھ پڑھکر ان سے سبق حاصل کرین اور اپنے ماضی سے ان کو تعلق پیدا ہو، لائق مولف نے اس کتاب مین انگریزی زبان مین عہد رسالت سے لیکر کمال اتاترک کے زمانہ تک اسلامی تاریخ کے منتخب واقعات دلچسپ انداز مین جمع کر دیے ہین، اس کا مطالعہ نوجوانون مین ان کے ماضی سے محبت اور تاریخ اسلام کا شوق پیدا کرنے کے لیے مفید ہے، کتاب کی خوبیون کے مقابلہ مین اس کے خفیف نقائص ناقابل التفات ہین، لیکن دو باتون کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، ایک یہ کہ آئندہ اڈیشن مین واقعات مین مستند تر ماخذون کے حوالے دیے جائین، اور بعض نامون کے ہجے عربی کتابون کی مدد سے درست کیے جائین مثلاً Khubain (ص ۲۲) کو Khubaib،

Thamama کو Samama ہونا چاہیے، اسی طریقے سے بعض اور ناموں کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے، گو استناد کے اعتبار سے اس میں بعض کمتر درجہ کی کتابوں کے حوالے ہیں لیکن واقعات سب صحیح ہیں جو مستند کتابوں میں بھی موجود ہیں اور واقعات کا انتخاب بہت اچھا کیا گیا ہے۔

مناجات مقبول مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مع ترجمہ و شرح مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: دار المصنفین علم گڈھ، صدق بک ایجنسی گولہ گنج لکھنو، الفرقان بک ڈپو امین آباد پارک لکھنو۔

مناجات مقبول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی منتخب و مرتب کردہ قرآنی و حدیثی دعاؤں کا مشہور و مقبول مجموعہ ہے، اس میں دو سو سے اوپر دعائیں ہیں، جو ورد میں سہولت کیلئے سات حزبوں میں تقسیم ہیں، متن کیساتھ پرانے طرز کا اردو ترجمہ بھی تھا، اب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس میں ترمیم کرکے اسکو زیادہ سلیس اور موجودہ مذاق کے مطابق بنا دیا ہے، اور حاشیہ میں ہر دعا کی ضروری تشریح کردی ہے، اور اسکے حکم و مصالح اور ان سے متعلق ضروری فوائد و نکات بھی تحریر فرما دیے ہیں جس سے ان دعاؤں کی دلنشینی اور جذب و کشش میں اور اضافہ ہو گیا ہے، یہ مجموعہ ہر مسلمان کے ورد میں رہنے کے لائق ہے،

ریاض ہاشمی از جناب محمد شرف الدین صاحب سلیم علوی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ: ادبستان بخیار منزل بوزنگ پیٹ مدراس

مصنف جنوبی ہند کے مشہور شاعر ہیں، ریاض ہاشمی انکی نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے اس میں سو سے اوپر نعتیں ہیں، اور چند حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی کی منقبت میں شاعری کی حیثیت سے نظمیں خاصی ہیں، اور ان کے بہت سے متفرق اشعار نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں، لیکن مذہبی حیثیت سے خیالات میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے، جس سے اس قسم کی نظمیں بہت کم خالی ہوتی ہیں جن لوگوں کو اس قبیل کی نظموں کا ذوق ہو یہ مجموعہ ان کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

عرب کی موجودہ حکومتیں

جزیرۃ العرب کے ساتھ مذہبی تعلق و عقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو نجد و حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصوں اور حکومتوں کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، اس لیے اس کتاب میں عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابل ذکر حکومتوں نجد و حجاز، عسیر و یمن، خلیج نواحی مسقط بحرین، کویت اور فلسطین و شام کے مختصر حالات جمع کر دیے گئے ہیں ضخامت ۰۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"